انتہاؤں میں رابطہ۔۔۔۔۔۔۔۔ پرنٹ اور ڈیجیٹل ایک ساتھ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

چیف ایڈیٹر: محمود شام

128

اپریل 2025

قیمت: پاکستان میں 500 روپے۔۔۔ بیرون ملک: 5 ڈالر (ای میگزین سالانہ 20 ڈالر)

ARIF HABIB GROUP
Arif Habib Corp
ARIF HABIB DOLMEN
REIT MANAGEMENT LIMITED
POWER CEMENT
مضبوطی ۔ چٹانوں جیسی
AISHA STEEL
MILLS LIMITED
Fatima
Fertilizer Company Limited
JV of Fatima and Arif Habib Group
ARIF HABIB
LIMITED
NAYA NAZIMABAD
A MARK OF PRIDE
JAVEDAN
CORPORATION LIMITED
SACHAL
Energy Development
(Pvt) Limited
Arif Habib Group, Arif Habib Centre, 23 MT Khan Road, Karachi

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جلد:12 شمارہ:3-4

مارچ/اپریل 2025

قیمت فی پرچہ:500 روپے۔سالانہ: 5000 روپے۔بیرون ملک۔50ڈالر

چیف ایڈیٹر: محمود شام

ایڈیٹر: خان ظفر افغانی

پروجیکٹ ہیڈ''اطراف''ڈیجیٹل:رخشندہ محمود

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز:تنویر شہزاد(لاہور)،عبدالغفور چوہدری(کینیڈا)عاصم متین خان(نیویارک)

نمائندہ خصوصی: محمد اجمل(کوئٹہ)،پروفیسر شاداب احمد صدیقی(حیدرآباد)

مارکیٹنگ: محمد آصف 0331-0063311 عکاسی:شکیل قریشی

سرکولیشن مینیجر: راجہ شاہد 0332-2561774 0300-8210636

اپریل خاص

رمضان اور عید عالمگیر سروے 20-11

پاکستان کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہمت دے — اطرافیہ — 05

مسجد نبوی میں — ☆ شائستہ اکرام اللہ — 22-21

حیدرآباد دکن میں رمضان — افروز یس اختر — 24-23

ملائشیا میں رمضان — ☆ حافظ نعمان ساجد — 27

امریکہ میں رمضان اور عید — ☆عاصم متین خان(نمائندہ خصوصی) — 30-29

پشاور میں رمضان — ☆عمر حیات — 32-31

گجرات میں رمضان اور عید — ☆نازیہ آصف، گجرات — 34-33

گوجرانوالہ میں رمضان اور عید — ☆صدام ساگر — 36-35

بورے والا میں رمضان اور عید — ☆رانا محمد شاہد — 39-40

عمر کا سورج — ☆سعیدہ افضل کی آپ بیتی — 42-41

مجھے یاد ہے ذرا ذرا...... — ☆مہناز حسن، سابق ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات سندھ — 49-47

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا — ☆فرید ذکریا — 53-51

اعتراف خدمت اعزاز انٹرویوز — ☆ جہاں آرا — 70-55

تذکرہ کتابوں کا — ☆ خان ظفر افغانی — 85-83

تمغۂ کراچی — ☆ خان ظفر افغانی — 88-87

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔مقام اشاعت: اے 262بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط وکتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ:www.atraafmagazine.com

AM
AL MASHWAN TRAVEL AND TOURS
From anywhere to anywhere in the World
We are just a phone call away
021-34545100
0300 8220435
PLAN YOUR UMRAH NOW
JOURNEY OF THE HEART
PACKAGE INCLUDES
VISA | AIR TICKET | ACCOMODATION | GUIDES | GROUND TRANSPORT | HISTORICAL SITES TOUR IN MAKKAH MUKARRAMA & MADINAH MUNAWARA
More information call / Whatsapp
+92 0300 8220406
+92 0300 8220407
BOOK NOW
almashwan
Address:
Plot No136 Muslim Colony, Shahrah-e-Faisal Rd, near FTC Building, Block B Sindhi Muslim CHS (SMCHS), karachi, Sindh 75350.

پاکستان کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہمت دے

امید ہے آپ رمضان المبارک کی رحمتیں برکتیں مغفرتیں سمیٹ رہے ہوں گے۔عید الفطر کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔اپنی زکوۃ انڈس ہسپتال۔ پاکستان آئی بینک ہسپتال۔شوکت خانم ہسپتال۔ ایدھی۔چھیپا۔اخوت۔ برنس سینٹر۔ دی سٹیزن فاؤنڈیشن۔الخزمت۔ فاطمید اور اپنے اپنے علاقوں میں خدمت خلق کرتے رفاہی اداروں کو دے رہے ہوں گے رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جو آپ کی خیر کو پوری طرح فعال ہونے کا موقع دیتا ہے۔آپ کی دریا دلی کو بہنے کا اذن ملتا ہے۔آپ کا شر چھپتا پھرتا ہے قابل تحسین ہیں وہ بھائی بہن مائیں بزرگ جوان تین عشروں میں صرف عبد اور معبود کے رشتے کو مضبوط کرتے ہیں۔انسان اور انسانیت کی قدر کرتے ہیں۔اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں۔اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ سال میں ایک یہی مہینہ ہے جو آپ کو اپنے آپ سے ملاتا ہے جب انسان اپنے آپ سے ملتا ہے تو وہ اپنے رب سے ملتا ہے۔دین اور دنیا کی فکر مشترکہ ہونی چاہیے۔دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ نہیں کیا جاسکتا۔اسلام رہبانیت کا قائل نہیں ہے رمضان یہی یقین دلاتا ہے کہ تنگدستی ہمیشہ نہیں رہتی۔ظلم دائمی نہیں ہے۔قرآن پاک ان دنوں میں نہ صرف تراویح میں سنا جاتا ہے گھر میں بھی پڑھا جاتا ہے ہر روزے دار ایک قرآن تو مکمل کرتا ہی ہے جنہیں اللہ تعالی توفیق دیتا ہے وہ ایک سے زیادہ قرآن بھی پورے کرتے ہیں۔قرآن پاک ناظرہ پڑھتے ہوئے ترجمے پر بھی نظر چلی جاتی ہے جہاں انسان کو بار بار یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالی کی سب سے اشرف مخلوق ہے۔اسے سر صرف خالق حقیقی کے سامنے جھکانا ہے۔انسان خواہ کتنے ہی طاقتور ہوں کتنے ہی ظالم ہوں کتنے ہی سفاک ہوں ان کے سامنے دوسرے انسان کا سر نہیں جھکنا چاہیے۔سپر طاقت ایک ہی ہے.رمضان آپ کو اپنا جائزہ لینے اپنی روح میں اترنے کی دعوت بھی دیتا ہے.اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنے کی ہمت بھی دیتا ہے.سوچنے بیٹھیے کیا ہو رہا ہے کیا ہونے والا ہے اور کیا ہوگا؟ کوئی واقعہ بھی بلا سبب نہیں ہوتا اصول فطرت ہے۔سبب اور اس کا اثر۔وجہ اور اس کا نتیجہ۔کوشش اور اس کا ثمر۔اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیجئے آج اگر افراتفری ہے۔گرد و غبار ہے۔جھاڑیاں از خود اگ رہی ہیں کہیں کوئی پھول کھلتے دکھائی نہیں دیتے۔شہر شہر پارک اجڑے ہوئے ہیں۔روش روش مٹی ہے۔یہی وہ دن ہیں جب آپ اپنے معبود حقیقی سے دل کی گہرائی سے یہ استطاعت مانگیں کہ آپ کو اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے کی ہمت دے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ 77 سال گزرنے پر پاکستان ایک مستحکم منظم ریاست ہوتا جہاں قانون کا نفاذ سب کے لیے یکساں ہوتا" اسلامی جمہوریہ پاکستان" کا لقب جب منتخب ارکان اسمبلی نے آئین کا حصہ بنایا تو ان کے ذہن میں یقینا اسلامی کا وسیع وعریض پس منظر بھی ہوگا اس کی حدود و قیود بھی ہوں گی اس کی نعمتیں بھی پیش نظر ہوں گی۔جمہوریہ کے لوازمات بھی سامنے ہوں گے۔جمہور کی بالادستی کا تصور بھی واضح ہوگا۔رمضان کے مبارک لمحات ہم سب کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہمیں سارے صوبوں کے لیے وحدتوں کے لیے ایک سسٹم ایک نظام قائم کرنا ہے جس میں سب آئین اور قانون کی پیروی کرتے ہوں۔یہ نہ ہو کہ با اثر ٹولے اپنی بات منوانے کے لیے آئین میں ہی ترامیم کر ڈالیں۔قانون بدل دیں۔لاقانونیت قانون بن جائے۔اداروں پر افراد غالب آجائیں۔با اثر لوگ دندناتے پھریں۔ملک کے مالک عوام کی اکثریت حیران و پریشان ہو۔بے نوا چیخیں چلائیں کوئی ان کی نہ سنے۔کہیں سے کوئی حوصلہ دلاتی خبر نہ آئے۔لوگوں کو مایوسی سے نکالتی ہستیاں سرگرم نہ ہوں۔اخبارات حقیقت سے بہت دور لے جا رہے ہوں۔چینل حقائق بتانے کے بجائے دولت سمیٹنے میں مصروف ہوں۔کسی اسمبلی میں عالمی علاقائی مقامی حالات پر بحث نہ ہو رہی ہو۔اجتماعی فکر کے بجائے ایک فرد کی سوچ ہی فرمان امروز ہو۔دانش خاک بسر ہو۔منطق گھٹنوں میں سر دیے ہو۔تاریخ کو بین بھی نہ کرنے دیا جائے۔حقیقت یہ ہے کہ رمضان میں آسمان زمین بہت قریب ہو جاتے ہیں یہی وہ دن ہیں جب مظلوم کی آہ عرش تک پہنچتی ہے ظالم کی گردن گرفت میں آتی ہے۔عید الفطر اللہ تعالی کی طرف سے ہم سب کے لیے ایک بہت بڑا انعام ہے۔روزے کے دوران ہم اپنی خواہشات ذاتی مفادات کی قربانی دیتے ہیں۔اجتماعی مفادات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ذات کے بجائے ملت اور امت کا سوچتے ہیں اپنے سے مالی طور پر کمزور لوگوں سے تعاون کرتے ہیں اس غفار و قہار سے یہی تمنا ہے یہی التجا ہے کہ پاکستان کو پاکستان کے حکمران طبقوں کو اس راستے پر چلا جس پر تیری نعمتیں نازل ہوتی رہی ہیں ان راستوں سے ہٹا دے جن پر تیرا غضب نازل ہوتا ہے آمین ثم آمین۔

محمود شام

کفالتِ یتیم سے --- جنّت کا حصول بھی --- رفاقتِ رسولﷺ بھی
الخدمت
ALKHIDMAT
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN
AGHOSH COLLEGE
دُعاء
تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے
تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے
آپ بھی زکوٰۃ و عطیات دے کر شامل ہو جائیں ۔۔۔ لاکھوں دُعاؤں میں
زکوٰۃ اور عطیات کے لیے
زکوٰۃ میزان بینک 02140101095120
عطیات میزان بینک 02140100861151
0800 44448
www.alkhidmat.org/give

اعترافِ خدمت اعزاز

2024 کی اعزاز یافتگان

ڈاکٹر راشدہ ارتفاق علی
بانی چیئرپرسن شعبہ فوڈ سائنس ٹیکنالوجی جامعہ کراچی

جسٹس (ر) ڈاکٹر ماجدہ رضوی
ہائی کورٹ کی پہلی خاتون جج

پروفیسر ڈاکٹر پروین موسیٰ میمن
شعبہ سندھی سندھ یونیورسٹی

ہنی رضا
ٹاؤن ایجوکیشن آفیسر کراچی

سسٹر ڈاکٹر الزبتھ نیامت
پرنسپل سینٹ جوزف کالج برائے خواتین کراچی

ڈاکٹر طاہرہ ایس خان
شعبہ تاریخ کولمبیا یونیورسٹی

2023 کی اعزاز یافتگان

ثروت نسیم شاہ
مخیر۔ شاعرہ۔ بلڈر۔
چیئرپرسن بینائی فاؤنڈیشن

ثروت سلطانہ ثروت
مصنف۔ لیکچرر۔ شاعرہ۔
35 سے زیادہ تصنیفات

ڈاکٹر ہما بقائی
اینکر پرسن۔ ماہر تعلیم۔ ریکٹر انسٹی ٹیوٹ
آف مینیجمنٹ ٹیکنالوجی اینڈ انٹرپرینیورشپ

نور الہدیٰ شاہ
دانشور۔
ممتاز ڈرامہ نگار

سسٹر کلارا حسین
پرنسپل، کانونٹ آف
جیسس اینڈ میری

ڈاکٹر صوفیہ احمد
ڈین۔ ایف پی ایس
بقائی میڈیکل یونیورسٹی

زبیدہ مصطفےٰ
صحافی۔ مصنف۔
سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ ڈان

2022 کی اعزاز یافتگان

جسٹس عائشہ ملک
سپریم کورٹ کی پہلی خاتون جج

اٹلی کی گریزیہ ماریہ پاؤلا
36 سال سے سماعت سے
محروم بچوں کے لیے وقف

ڈاکٹر عبیرہ معراج
کووڈ میں دن رات مسیحائی میں مصروف

امت الصبور
پچاس سال سے باقاعدہ اشاعت
والے خواتین ڈائجسٹ کی مدیرہ

سامیہ لیاقت علی
پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی پوتی

منزہ سہام مرزا
پچاس سال سے باقاعدہ اشاعت والے
دوشیزہ، سچی کہانیاں کی مدیرہ اعلیٰ

2020 کی اعزاز یافتگان

سینئر میری لانگن
پرنسپل کانونٹ آف جیسس
اینڈ میری کلفٹن کراچی

کرشنا کوہلی
ممبر سینٹ آف پاکستان

ڈاکٹر ثانیہ نشتر
معاون خصوصی برائے وزیراعظم

مس اکرم خاتون
فرسٹ ویمن بینک کی پہلی صدر

پروفیسر ڈاکٹر بلقیس گل
Director Institute of Sustainble Halophyte Utilization, University of Karachi

2019 کی اعزاز یافتگان

سلطانہ صدیقی
چیئرپرسن ہم ٹی وی

قمر النساء قمر
تحریک فلاح خواتین، کراچی

کلپنا دیوی
اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل سندھ

رخسانہ جبیں
وائس چانسلر سردار بہادر خان یونیورسٹی، کوئٹہ

نرگس لطیف
گل بہاؤ تحریک، چاندی گھر

2018 کی اعزاز یافتگان

سعدیہ راشد
ہمدرد فاؤنڈیشن

شہناز وزیر علی
زمیست

شمع خالد
افسانہ نگار

تارا عذرا داؤد
داؤد گلوبل فاؤنڈیشن

پروفیسر ڈاکٹر پروین شاہ
جامعہ شاہ عبداللطیف، خیرپور

2017 کی اعزاز یافتگان

بلقیس ایدھی
ایدھی فاؤنڈیشن

امینہ سید
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

سیما مغل
گرین اچ یونیورسٹی

طاہرہ رضا
صدر فرسٹ ویمن بینک

اعترافِ خدمت اعزاز 2025

مہتاب اکبر راشدی

نجیبہ عارف

کرمین پاریکھ

عفت سلطانہ

نسیم انجم

ہما بیگ

جیسمین پطرس

معزز خواتین سے انٹرویوز صفحہ 55 سے صفحہ 70 پر ملاحظہ کریں

TRANSFORM YOUR
CORPORATE AND BUSINESS IMAGE

WITH
SAEEDABBASI LOBBYIST
YOUR GLOBAL LOBBYING ADVISOR

FOUNDER / CEO
Saeed Khan Abbasi

Founder CEO, Saeedabbasi Lobbyist,25+ years extensive practical experience in print & electronic media, public relations, public speaking, international trade events and promotions, capacity building training etc.

We Offer

- Reputation and Image Building
- Enhanced Business Growth
- Government Relations
- Public Relations
- Stakeholder Relations
- Crisis Management
- Market / Sector Access

Saeedabbasi Lobbyist and Grand Mark form a strategic Partnership to boost customers and investors support.

Take your Business And Corporate Success to the Next Level Through our Global Standard of Corporate and Business Lobbying Services

Contact us Now

+92 304 2476241
saeed.abasi@outlook.com
www.saeedabasilobbyist.com
saeedabasilobbyist
saeedlobbyist
saeedabasilobbyist

Office: Suite F-57, Second Floor, Defense Mall, D.H.A, Phase-1, Karachi, Pakistan

DAVAAM life

Pakistan Standards

PS: OIML R 117-2/2014

Certified By PSQCA

Edible Oil
Refill Machine

Automatic Vending / Dispensing Machine

3-EASY STEPS TO REFILL

1. SELECT PRODUCT
2. SELECT QUANTITY
3. LET IT REFILL

Davaam Life (Pvt) Ltd ***#JoinTheDispensingRevolution*** ***www.Davaam.life***

’اطراف‘ عالمگیر سروے

Monthly
ATRAAF
A MAGAZINE - A THINK TANK
Bridging Extremes

ماہنامہ اطراف کراچی
انتہاؤں میں رابطہ

’اطراف‘ عالمگیر سروے

رمضان کی برکتیں اور عید کی مسرتیں

1۔ پہلا روزہ آپ نے کب رکھا تھا۔
2۔ رمضان کے پورے روزے کب سے رکھنا شروع کیے۔
3۔ تراویح۔ کتنے روز والی ادا کرتے ہیں۔
4۔ سحری کے وقت موبائل کے الارم سے۔ ٹائم پیس کے الارم سے جاگتے ہیں۔ یا ڈھول بجانے والوں کی آواز پر۔
5۔ سحری پر سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا کیا دستر خوان پر ہوتا ہے۔ کھجلہ۔ پھینی بھی۔
6۔ اوقات کار بدلتے ہیں۔ یا وہی رہتے ہیں۔
7۔ افطار گھر میں۔ دفتر میں یا مسجد میں۔
8۔ افطار کے لیے دستر خوان پر کیا سجا ہوتا ہے۔ کونسا شربت پسند کرتے ہیں۔
9۔ رمضان کے مہینے میں کتنے قرآن پاک ختم کرتے ہیں۔
10۔ بچوں کی روزہ کشائی پر کوئی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر اس کی وڈیوز یا تصاویر دیتے ہیں۔
11۔ زکوٰۃ فلاحی اداروں کو دیتے ہیں۔ یا اپنے غریب عزیزوں یا محلے داروں کو۔
12۔ عیدالفطر کے لیے تیاریاں کب سے شروع کرتے ہیں۔ کیا کیا ضروری سمجھتے ہیں۔
13۔ نئے کپڑے سلواتے ہیں۔ بنے بنائے خریدتے ہیں۔ یا آن لائن منگواتے ہیں۔
14۔ رمضان کے دوران سوشل میڈیا کو وہی وقت دیں گے یا کچھ کمی کریں گے۔
15۔ رمضان پر ٹی وی چینلوں کی خصوصی نشریات عبادتوں میں خلل ہے یا ان کا دیکھنا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ اگر دیکھتے ہیں تو کس چینل کی نشریات۔
16۔ عیدالفطر پر آپ کی دلی دعا کیا ہوگی۔
17۔ نماز عید قریبی مسجد میں یا شہر کی عید گاہ میں۔
18۔ رشتے داروں کو۔ دوستوں کو۔ عید کارڈ بھیجتے ہیں۔ واٹس ایپ پر عید مبارک کہتے ہیں یا ملنے جاتے ہیں۔
19۔ سمندر پار بچوں۔ عزیزوں سے آڈیو عید مبارک یا وڈیو۔
20۔ آپ کے شہر میں مسافروں۔ عام شہریوں۔ غریبوں کے لیے سر راہ افطار کا اہتمام ہوتا ہے۔

ممنون ہوں گے۔ اگر 10 فروری 2025 تک آپ اپنے جوابات عنایت کر سکیں

والسلام

محمود شام

Address: A-262, Block3, Gulshan-e-Iqbal, Karachi.
0300-8210636 mahmoodshaam@gmail.com www.atraafmagazine.com

پہلے تو معذرت کہ اطراف آپ کی خدمت میں تاخیر سے پیش ہو رہا ہے۔ کچھ دفتری مشکلات کے باعث ہم مارچ میں شمارہ نہیں مرتب کر سکے۔

اطراف کے عالمگیر جائزوں کی روایت بہت پسند کی جا رہی ہے۔ حصّہ لینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں رائے عامہ جاننے کے لیے یہی گیلپ سروے کا طریقہ رائج ہے۔ اطراف نے بھی فیس بک۔ انسٹا گرام۔ واٹس ایپ کے ذریعے یہی راستہ اپنایا ہے۔ ہمیں مسرت ہو رہی ہے یہ بتاتے ہوئے کہ قارئین اطراف ان جائزوں میں پوری دلچسپی اور ذمہ داری سے حصہ لیتے ہیں۔ یوں ہمارے سامنے اردو پڑھنے والوں کے رجحانات سامنے آتے ہیں اور اطراف اس طرح رجحان ساز رسالہ بنتا جا رہا ہے۔

پہلا روزہ پانچ برس کی عمر میں رکھا۔

شاہد بخاری ایڈوکیٹ۔ لاہور

افطار پھل، مختلف کھانے شربت روح افزا

ضیاء الدین، باجوڑ

افطار میں پھل، روح افزا، شکنجبین

غلام مصطفیٰ۔ ضلع ملتان

افطار دستر خوان سادہ فروٹ چاٹ روح افزا

جویریہ یاسمین۔ میرپور آزاد کشمیر

ڈیفنس کے رہائشی زیادہ تر رات بھر جاگتے ہیں، ڈھول کی ضرورت نہیں رہتی

ریحانہ اعجاز، ڈیفنس۔ کراچی

روح افزا روزانہ، مختلف دنوں میں سموسے، چاٹ، دہی بڑے

سید سلمیٰ بخاری، لاہور

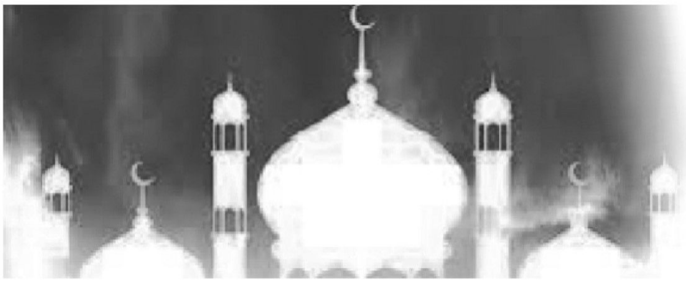

رمضان میں ٹی وی پروگرام زیادہ لغو لگتے ہیں
آفتاب میمن۔کراچی

تیاری رجب شعبان میں، رمضان میں بازار نہیں جاتے
صالحہ عاطف۔کراچی

روزہ کشائی پر تقریب منعقد کرتے ہیں
یاسر فاروق

شربت سب کو روح افزا ہی پسند ہے
حافظہ حفصہ عبدالرحمٰن

ٹی وی نشریات وقت کا ضیاء ہے نہیں دیکھتے
عشرت شاہین ایڈوکیٹ

ٹی وی پروگرام عبادت نہیں ہیں، ہم نہیں دیکھتے
کاشف سومرو

ٹی وی پرگرام دیکھنے میں کمی کریں گے
مبشر ہاشمی۔جھنگ

ٹی ٹی وی چینل کی نشریات عبادت میں خلل نہیں ہیں
انجنئیر خالد عمر لاہور

افطار میٹھے دہی بڑے، کالے چنے اور روح افزاء
وقار زیدی۔کراچی

رمضان کی برکتیں اور عید کی مسرتیں
اختر علی مغل (سڈنی، آسٹریلیا)

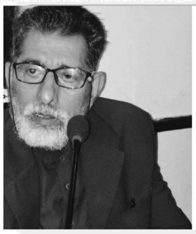

عید کی نماز قریبی جامع مسجد میں

شاہد بخاری، ایڈووکیٹ

1. پانچ برس کی عمر میں۔1954ء میں 2. 15برس کی عمر سے 1964 سے 3. 29روزے والی۔ 4.موبائل کے الارم سے 5۔سب اکٹھے۔کبھی پھلکیاں۔کبھی جلیبیاں کبھی شیر مال ہمراہ دودھ۔ 6۔وہی رہتے ہیں۔ 7۔گھر میں۔ 8۔روٹی۔سالن۔سکنجبین
9۔دوتر جمے کے ساتھ 10۔تشہیر نہیں کرتے۔ 11۔محرومین کو 12۔اب کوئی تیاری نہیں۔کچھ ضروری نہیں۔ 13۔جب تک چچا جی، زندہ رہے دونوں عیدوں پر میرے اور اپنے نئے کپڑے اور نئے جوتے وہی خریدتے تھے۔ 14۔کمی آجاتی ہے۔زیادہ وقت قرآنی ترجمے کو
15۔جو بچے لگالیں، وہی دیکھ لیتے ہیں۔ 16۔اللہ مسلمانوں کو ذلت سے بچائیں۔فلسطینیوں مقبوضہ کشمیریوں اور پاکستانیوں پر رحم فرمائیں۔
17-قریبی جامع مسجد میں 18. وٹس ایپ پر عید مبارک کچھ کو ملنے بھی جاتے ہیں۔ 19۔آڈیو ویڈیو مبارک باد 20۔مساجد میں اور ریسٹورانز میں بھی۔
(شاہد بخاری ایڈووکیٹ 651ڈی۔فیصل ٹاؤن۔لاہور۔مدیر ماھنامہ سفید چھڑی۔کالم نگار۔نکھار۔بلدیات۔ایمرا۔سابق مدیر ادب لطیف۔ادبی کالم نگار، اخبار جہاں۔03004855148والسلام)

عیدالفطر کے لیے تیاریاں ہم بیسویں روزے کے بعد شروع کرتے ہیں

رمضان پورا مہینہ۔ سوشل میڈیا نہ ٹی وی چینل

ضیاالدین، باجوڑ طالب علم شعبۂ اردو

1 پہلا روزہ میں نے 2008 میں رکھا تھا۔ 2 رمضان کے پورے روزے 2012 میں رکھنا شروع کیے۔ 3 ہم گاؤں والے 15 روزے کے بعد تراویح ادا کرتے ہیں۔
4 سحری کے وقت ڈھول سے ہم جاگتے ہیں۔ 5 سحری پر ہم اکٹھے ہوتے ہیں اور رات کا بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ 7 افطار اکثر گھر میں اور کبھی کبھی مسجد یا حجرے میں کرتے ہیں۔
8 افطار کے لیے دسترخوان میں فروٹ اور مختلف قسم کے کھانے اور شربت روح افزا۔ 9 رمضان میں 2 سے 3 تک قران پاک ختم کرتا ہوں۔ 10 بچوں روزے پر کوئی پروگرام نہیں کرتے کیوں کہ یہاں اکثر بچے بخوشی روزے رکھتے ہیں۔ 11 ہم باجوڑ کے تمام لوگ غربا میں زکوٰۃ تقسیم کرتے ہیں۔ 12 عیدالفطر کے لیے تیاریاں ہم بیسویں روزے کے بعد شروع کرتے ہیں۔
13 نئے کپڑے سلواتے ہیں۔ 14 رمضان کے دوران سوشل میڈیا کو وقت نہیں دیتے۔ 15 رمضان کے مہینے میں ٹی وی چینلوں پر ہم نشریات نہیں دیکھتے ہیں۔ واقعی یہ عبادت میں خلل پیدا کرتا ہے۔ 16 عیدالفطر پر میری دعا اپنی پیاری اماں کے لیے ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ 17 نماز عید قریبی گاؤں کی مسجد میں ادا کرتا ہوں۔ 18 دور دراز دوستوں کو واٹس اپ پر اور قریب ے دوستوں سے ملنے جاتے ہیں۔ 19 نہیں۔ 20 نہیں

سب گھر والے موبائیل الارم سے جاگتے ہیں

غلام مصطفیٰ طالب علم۔ ضلع: ملتان

میں نے بچپن میں پہلا روزہ اس وقت رکھا جب دوئم جماعت میں پڑھتا تھا۔ والدین اصرار کرتے رہے کہ ابھی آپ چھوٹے بچے ہو اور سارا دن کیسے بھوکے، پیاسے رہوگے؟ امی، ابو کہنے لگے کہ سب کے ساتھ سحری کرلو مگر روزہ نہ رکھو۔ لیکن میں نے سحری کی اور چپ چاپ روزہ رکھ لیا۔
رمضان کے پورے روزے تو آج تک بھی نہ رکھ سکا کیوں کہ ہر سال دس سے پندرہ روزوں کے بعد طبیعت ناساز ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ "افطار" میں بے احتیاطی سے کھانا اور زیادہ پانی پینا ہے۔
بات کریں سحری کی تو موبائل الارم سے سب گھر والے جاگ جاتے ہیں۔ امی جان کھانا پکاتی ہیں۔ سب بہن بھائی دسترخوان پر بیٹھ جاتے ہیں اور سب مل کر سحری کرتے ہیں سب مسلمانوں کے لیے خوب دعائیں کرتے ہیں۔ ہم چونکہ دیہات میں رہتے ہیں تو سحری میں پراٹھے کے ساتھ دہی اور لسی کا استعمال کرتے ہیں۔
بابرکت مہینے میں سارا دن ذکر اذکار میں ہی گزرتا ہے۔ سوشل میڈیا کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔۔ مساجد بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہر نماز کے وقت دو سے تین صفیں نمازیوں سے بھر جاتی ہیں۔
افطاری کی تیاری عصر کے بعد شروع ہوجاتی ہے۔ فروٹ، روح افزا، شکنجبین، سموسے پکوڑے اور روٹی دسترخوان کی زینت بنتے ہیں۔
عید نماز کی ادائیگی سے پہلے اسلام زکوٰۃ و فطرا کا حکم دیتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ اپنے محلے ہی میں دیں۔
پورے مہینے کے روزوں کے بعد عید کا دن کسی انعام اور نعمت سے کم نہیں۔ بچے، بزرگ، خواتین سب خوش نظر آتے ہیں۔ 20 روزے جیسے ہی گزرتے ہیں عید کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ نئے کپڑوں، جوتوں اور دیگر سامان کی خریداری شروع ہوجاتی ہے۔
اپنے گھر والوں میں سے سب سے پہلے میں "عید نماز" کی تیاری کرتا ہوں۔ جلدی جلدی مسجد پہنچتا ہوں۔
عید نماز کی ادائیگی کے بعد سب دوستوں کو عید ملتے ہیں اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ جن دوستوں کا گھر دور ہوتا ہے ان کو بھی ملنے جاتے ہیں۔
بازار، گلی، محلے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بچوں کا شور اور ان کی خوشی عید کا احساس دلاتی ہے۔ گھروں میں کھانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور مہمانوں کی آمد کا انتظار بھی کیا جاتا ہے۔
پاکستان میں ماہ رمضان کے حوالے سے خامیاں اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ۔
پھلوں کے ریٹ میں بہت زیادہ اضافہ کپڑے اور جوتوں کی دکانوں پر آخری دنوں میں شاپنگ۔ درزیوں کی دکانوں پر آخری دنوں میں کپڑوں کی سلائی۔ حیرت انگیز بات تو یہ

ہے کہ ہم ماہ رمضان میں رکھتے تو روزے ہیں مگر مسلم معاشرے میں کھانے پینے کی اشیاء سال بھر سے زیادہ ماہ رمضان میں فروخت ہوتی ہیں؟

پہلے عید کارڈ بھیجتے تھے۔ اب واٹس ایپ

جویریہ یاسمین میرپور آزاد کشمیر

پہلا روزہ سات یا آٹھ سال کی عمر میں رکھا ہوگا کیونکہ ہمارے والدین شوقیہ روزوں کے قائل نہ تھے۔ بارہ سال سے پورے روزے باقاعدہ رکھوائے جاتے تھے۔ تراویح کبھی آٹھ کبھی بارہ اور کبھی بیس پڑھتی ہوں البتہ رمضان میں تہجد التزام سے پڑھتی ہوں، الارم سے جاگتی ہوں بچپن میں ڈھول والا آتا تھا اب یہ رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ سحری سب اکٹھے کرتے ہیں اگر بچے گھر پر ہوں، اوقات کار بدلتے ہیں کالج صبح جلدی کھلتا ہے اور جلدی بند ہوتا ہے۔ افطار گھر پر ہی ہوتا ہے البتہ میاں صاحب کبھی مسجد میں بھی کر لیتے ہیں۔ افطار کا دسترخوان سادہ ہوتا ہے فروٹ چاٹ روح افزا سکنجبین اور نارمل کھانا البتہ افطار پر مہمان مدعو ہوں تو پھر پکوڑے سموسے دہی پھلکیاں چکن روسٹ یا باربی کیو اور پر تکلف کھانا سبھی کچھ ہوتا ہے۔ ہر عشرے میں ایک اور کل تین قرآن پاک التزام سے پڑھتی ہوں اس کے علاوہ کالج کی طالبات کے لئے ایک گھنٹے کا درس قرآن دیتی ہوں اس طرح ایک قرآن پاک اجتماعی طور پر بھی پڑھا جاتا ہے۔ نہ اپنے بچپن میں روزہ کشائی کی تقریب ہوئی نہ بچوں کے لئے اہتمام کیا روزہ تبھی رکھا اور رکھوایا جب فرض ہو گیا البتہ میرے بیٹے نے اپنے شوق سے کلاس سوئم سے باقاعدہ روزے رکھنے شروع کر دیئے تھے تو منع نہیں کیا' زکوٰۃ فلاحی اداروں کو بھی دیتے ہیں اور ناداروں کو رمضان کے آغاز پر ہی غذائی ضروریات کی اشیاء خرید کر دے دیتے ہیں عیدالفطر کے لئے کچھ خصوصی ڈشز ضرور بنتی ہیں لیکن بہت پہلے تیاری کی ضرورت پیش نہیں آتی بچے چھوٹے تھے تب بھی اور اب بڑے ہو گئے اب بھی ان کے لئے نئے کپڑے بنواتے ہیں کبھی آن لائن بھی منگوا لیتے ہیں البتہ ہم میاں بیوی سپیشل نہیں بنواتے کوئی بنا ہو تو عید کے لئے رکھ لیتے ہیں۔

سوشل میڈیا کو ویسے بھی کم وقت دیتی ہوں لیکن رمضان میں دوستوں کا ایک گروپ ہے جس میں دینی حوالوں سے ڈسکشن چلتی رہتی ہے رمضان میں اس میں شامل رہتی ہوں۔ رمضان کی نشریات کبھی نہیں دیکھیں کیونکہ ان کے اوقات بہت عجیب ہیں اس وقت کچن میں ہوتی ہوں یا حسب توفیق عبادت کا اہتمام کرتی ہوں۔ عیدالفطر پر ہر سال کی طرح اپنے لئے بچوں کے لئے اہل خانہ کے لئے صحت و سلامتی اور ایمان کی سلامتی کی دعا ہوتی ہے پھر وطن کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے پھر تمام عالم اسلام کے لئے۔ بچپن میں ابا جی کے ساتھ عید گاہ جاتی تھی ابھی گھر پر پڑھتی ہوں یہی امی جان کا طریقہ تھا میں اور بیٹیاں گھر پر میاں صاحب اور بیٹا عید گاہ میں سوشل میڈیا کے آنے سے پہلے عید کارڈ بھیجتے تھے۔ لیکن اب واٹس ایپ پر میسج ضرور کرتی ہوں کچھ کو کال کرتی ہوں اور جو شہر میں ہیں ان سے ملنے بھی جاتی ہوں۔

سمندر پار بیٹا ہے عید پر طویل ویڈیو کالز ہوتی ہیں۔

ہمارے شہر میں الحمدللہ سحر اور افطار دونوں کا اہتمام ہوتا ہے ناداروں اور مسافروں کے لئے اور انتہائی معیاری بھی ہوتا ہے یہ اہتمام مساجد میں بھی ہوتا ہے ہوٹلوں میں بھی بازاروں میں بھی اور گلی محلے کی سطح پر بھی

میرا "ڈیفنس کراچی" اور رمضان المبارک

ریحانہ اعجاز کراچی۔عمار

رمضان المبارک اور عید سے جڑی ان گنت یادیں ہیں جو اپنے ماں باپ کے زیر سایہ بہن بھائیوں کے ہمراہ ماں باپ کے انگنا گزاری تھیں۔ رمضان کی آمد کے ساتھ ہی نمازوں کی پابندی، بہن بھائیوں کا مقابلے بازی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تلاوت قرآن پاک کرنا۔ ابو کا نرمی و گرمی سے تمام تر عبادات پر عمل کروانا۔ سحری میں امی کے ہاتھ کے مزیدار پراٹھے و چوری کھانا، دہی اور لسی سے استفادہ کرنا، افطاری میں امی کے لذیذ پکوان و پکوڑوں پر ہاتھ صاف کرنا۔ نئے کپڑے اور جوتے خریدنے کے بعد عید تک انہیں بار بار نکال کر دیکھنا۔ چاند رات کو مہندی لگانا۔ عید کی صبح نمازِ عید کے بعد تیار ہو کر چوڑیاں پہن کر ابو، امی اور بھائیوں سے عیدی وصول کرنا، اڑوس پڑوس سے عیدی لینے کے لیے سویاں دینے جانا، یادیں، یادیں اور بس یادیں ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ ان یادوں میں جو روایات ہیں ان میں سے بہت سی آج بھی

زندہ ہیں۔آیئے ماضی سے حال میں چلتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں دو دہائیوں سے زائد ڈیفینس کراچی کی رہائشی رہی ہوں۔ڈیفینس شہر کراچی کا پوش علاقہ ہے۔جہاں کے رہائشی الحمدللہ دنیاوی کے ساتھ ساتھ دینی وقومی وقار بھی رکھتے ہیں۔ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی ڈیفینس میں مساجد و بازار میں اک روحانیت محسوس ہوتی ہے۔مساجد میں تراویح کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے اور دکانوں پر کھجور، کھجلا، پھینیاں سج جاتی ہیں۔مغرب کے بعد روزہ افطار کرتے ہی مرد حضرات جوق در جوق مساجد کا رخ کرتے ہیں اور خواتین گھروں میں نماز کی ادائیگی کرتی ہیں۔بعدازاں افطاری وعشائیہ سے فراغت کے بعد نمازِ عشاء ونمازِ تراویح کا روح پرور منظر دل میں سکون واطمینان کا باعث بنتا ہے۔ڈیفنسمیں اکثر خواتین اپنے گھر پر اہتمام کرتی ہیں جہاں آس پاس کی خواتین خشوع وخضوع سے تراویح ادا کرتی ہیں۔

سحری کی رونقیں بھی عروج پر ہوتی ہیں۔البتہ ڈیفنس میں ڈھول بجانے اور چوکیدار کی آواز" روزے داروں اللہ کے پیارو، روزی رکھ لو" کی آوازیں عنقا ہو چکی ہیں کیونکہ ڈیفنس کے سبھی رہائشی رمضان المبارک میں پوری رات رت جگا کرتے ہیں۔عشاء اور تراویح کے بعد احباب جگہ جگہ نفاست سے بنے ہوئے ہوئے ڈھابوں کا رخ کرتے ہیں جہاں آپسی گفتگو کے علاوہ رمضان المبارک کے حوالے سے بحث ومباحثہ ہوتا ہے ۔معلومات ڈسکس کی جاتی ہیں۔سکہ رائج الوقت کے مطابق زکوٰۃ وفطرانہ کی ادائیگی سے متعلق اک دوسرے کو آ گاہی دی جاتی ہے اور رمضان میں ان دونوں فرائض کی خوش اسلوبی سے ادائیگی بھی کی جاتی ہے۔

جگہ جگہ نوجوان کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں۔سحری کا وقت ہوتے ہی اطراف میں حلوہ پوری، قیمے والے پراٹھے، آلو والے پراٹھے، چکن چیز پراٹھا، ملائی پراٹھا سمیت دیگر بہت سی اللہ کی نعمتوں کی خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں۔کئی گھروں میں خواتین یہ سب اہتمام خود کرتی ہیں جبکہ کئی گھروں میں ڈھابے سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ساتھ میں لسی، دہی اور چائے تو مشروط ہیں۔نماز فجر کی ادائیگی تک ہر گھر میں گہما گہمی رہتی ہے۔

پورے تیس دن ڈیفینس میں راتیں شب برات کا منظر پیش کرتی ہیں جبکہ دن میں جاب، اسکول، یونیورسٹی والے دو ڈھائی گھنٹے آرام کے بعد اپنی اپنی منزلوں کا رخ کرتے ہیں اور گھریلو خواتین ظہر تک نیند کے مزے لیتی ہیں۔شام میں وقت افطاری دسترخوان پر ازل سے پکوڑوں کا قبضہ رہا ہے جو ابد تک جاری رہے گا اس کے ساتھ ساتھ ان گنت لوازمات سے مثلاً چنا چاٹ، دہی بھلے، سموسے، مختلف مشروبات، فروٹ چاٹ، کباب، فروٹس، نگٹس وغیرہ کے ساتھ ہر گھر کا دسترخوان حسب استطاعت سجا ہوتا ہے اور کھجور تو افطاری میں لازم وملزوم ہے۔عید الفطر کے تین دن بھی رمضان المبارک کی رحمتوں اور برکتوں کی بدولت بہترین گزرتے ہیں جب ہر چہرہ خوشی طمانیت سے معمور ہوتا ہے۔عیدگاہیں اک ہجوم سمیٹے بڑی پرنور لگتی ہیں۔ نئے کپڑوں اور جوتوں کے ساتھ رنگارنگ غبارے، میچنگ کے چشمے، گھڑیاں، چوڑیاں آج بھی اس دن کا خاصہ ہوتی ہیں۔جن سے سجے ننھے فرشتے عید کی خوشیاں مناتے ہیں۔آج بھی ڈیفنس میں صبح دم اڑوس پڑوس میں شیر خورمہ سے سجی ٹرے لیے بچے اپنی عیدی کے منتظر ہوتے ہیں۔

دن چڑھنے تک عید کی نماز کے بعد رونق میں مزید اضافی ہو جاتا ہے جب عزیز واقارب عید کیکس کے ساتھ ایک دوسرے کے در پر دستک دے کر پیام عید دیتے ہیں۔

کھنکھناتی چوڑیاں اور مہندی کی خوشبو کے بنا خواتین کی عید ادھورہ ہوتی ہے اور باد صبا اسی خوشبو کو در در پہنچا کر عید کی نوید دیتی ہے۔

ڈیفینس فیز 2 سے اب میں کراچی عمار میں شفٹ ہو چکی ہوں جو ڈیفینس فیز 8 میں واقع ہے۔2025 کا میرا پہلا رمضان عمار میں گزرے گا اور مجھے یقین ہے یہاں بھی وہی سحر وافطار ہوں گے جو ہمارے کلچر کا ہمارے دین کا ہماری روایات واقدار کا حصہ ہیں۔

دعاؤں کی طالب۔۔۔۔۔ریحانہ اعجاز۔۔۔۔۔کراچی عمار

کم از کم ایک مکمل قرآن مجید ختم کیا جاتا ہے

ٹی وی چینلز کی نشریات عبادت میں خلل

سیدہ سلمیٰ بخاری۔لاہور

1۔۔چھ سال کی عمر میں پہلا روزہ رکھا تھا۔ 2۔۔بارہ سال کی عمر سے پورے روزے۔۔ 3۔۔تراویح گھر پر روزانہ ادا کی جاتی ہے 4۔۔سحری پر جاگنے کے لئے موبائل پر الارم لگا دیتے ہیں۔ 5۔۔جی سب اکٹھے سحری کرتے ہیں اور کھجلہ پھینی کے علاوہ پراٹھے۔دودھ دہی کھجور، سالن دلیہ وغیرہ ہوتا ہے 6۔۔اوقات کار بدل جاتے ہیں۔7۔۔افطار گھر میں ہی ہوتا ہے اور شرت روح افزا کے ساتھ مختلف دنوں میں سموسے، چاٹ، دہی بڑے، پکوڑے، چھولے کباب کسی بھی طرح کا میٹھا اور چاول کی کوئی ڈش یا سالن 9۔۔کم از کم ایک مکمل قرآن مجید ختم کیا جاتا ہے۔
10۔۔روزہ کشائی اب گھر ہی میں کر لی جاتی ہے اور تصاویر سوشل میڈیا پر شیئر نہیں کرتے۔ 11۔۔زکوۃ فلاحی اداروں اور غریبوں کو دیتے ہیں۔
12۔عید کی تیاری کوشش ہوتی ہے کہ رمضان المبارک سے پہلے شعبان المعظم میں ہی ہو جائے۔۔کپڑے جوتے آرائش کی چیزیں گھر کی صفائی ستھرائی وغیرہ اور کچھ رمضان کے آخری عشرے میں بھی تیاری ہوتی ہے
13۔۔کپڑے سلواتے ہیں۔14..سوشل میڈیا کے وقت میں کمی کریں گے۔ 15۔۔ٹی وی چینل کی خصوصی نشریات عبادت میں خلل سمجھتے ہیں اس لئے نہیں دیکھتے۔
16۔۔دلی دعا تو یہ ہے کہ اللہ پاک راضی ہو جائیں اس کے علاوہ اللہ سے دعا ہے کہ سب ایک دوسرے کے خیر خواہ ہو جائیں۔۔جانے کب ہوں گے کم۔۔اس دنیا کے غم۔17۔۔۔۔ 18۔عید کی مبارک باد واٹس ایپ پر بھی دیتے ہیں اور ملنے بھی جاتے ہیں اور ہم سے بھی لوگ ملنے آتے ہیں۔19۔۔سمندر پار عید کی مبارکباد آڈیو اور ویڈیو دونوں طرح دیتے ہیں۔ 20۔۔جی الحمدللہ سر راہ افطار کا اہتمام ہوتا ہے انشاءاللہ

عید مبارک بذریعہ کارڈ/ واٹس ایپ

آفتاب میمن۔کراچی

ا۔ 6/ 7 سال کی عمر میں۔ 2۔ 13 سال کی عمر سے۔ 3۔تراویح 16 رکعت ۔ 4۔موبائل کہاں تھے ۔گلی گلی پھیرا لگاکر ڈھول بجا کر اعلان کیا جاتا تھا۔ 5۔سحری کے لئے دسترخوان پہ سب اکٹھے ہوتے تھے۔کھانے کے لئے دھی یا دودھ اور ایک چپاتی۔ 6۔اوقات کار بدلتے رہتے تھے۔ 7۔ بزرگ افطار کے لئے کم ازکم دو جگ شربت کے۔جلیبی، پکوڑے آدھ آدھ کلو اور میٹھا جو آٹھ دس لوگوں کے لیئے ہو مسجد لے جاتے تھے۔ساتھ ایک عدد بیٹے کو۔کہ اسے بھی باجماعت افطار کا طریقہ سمجھنے کا موقع ملے۔ 8۔یاد نہیں۔ 9۔ختم کبھی نہیں کیا۔ 10۔یہ رواج نہیں تھا۔ اب بھی ہم بدعت سمجھتے ہیں۔ 11۔ فلاحی اداروں اور پڑوس کے غرباء 12۔کوئی تیاری نہیں کی کبھی۔ 13۔کپڑے سلواتے تھے۔ 14۔رمضان میں سوشل میڈیا یا ٹی وی کی طرف نہیں جاتے۔ 15۔ رمضان مین تو ٹی وی پروگرام اور زیادہ لغو لگتے ہین۔ 16۔دعائیں کم ہی مانگتے ہیں۔ 17۔نماز عید قریبی مسجد میں۔ 18۔عید مبارک بذریعہ کارڈ/ واٹس ایپ یا میسنجر۔ 19۔بیرون ملک رہائش پذیر بچوں سے سوشل میڈیا پہ/فون پہ بات ہوتی ہے۔ 20۔ہاں۔کراچی میں تو سر راہ راہگیر اور غرباء کے لئے بڑا اہتمام ہوتا ہے۔

رمضان میں سوشل میڈیا کیلئے وقت کم کردیتے ہیں

صالحہ عاطف۔کراچی

1۔10 سال کی عمر میں اپنی روزہ کشائی پر پہلا روزہ رکھا تھا 2۔ بائیس سال کی عمر سے پورے روزے رکھنے شروع کئے 3۔ پوری کوشش ہوتی ہے کہ پورے تیس دن تراویح کی ادائیگی کر سکوں۔۔ 4۔ موبائل کے الارم سے اٹھتے ہیں 5۔ سب اکٹھے سحری کرتے ہیں کھجلہ پھینی نہیں کھاتے سادی روٹی سالن کے ساتھ بچے پراٹھے کھاتے ہیں اس کے علاوہ دہی کی لسی اور کھجور

6۔ جی اوقات کار بدل جاتے ہیں۔۔ 7۔ گھر میں ہی افطار کرتے ہیں۔۔رمضان المبارک میں کہیں نہیں جاتے۔۔

8۔ بچوں کے لیے گھر میں بنائے گئے سموسے پکوڑے، چنے کی چاٹ، دہی پھلکیاں، گھر میں بڑے روٹی سالن کھاتے ہیں اس کے علاوہ فروٹ چاٹ، اسکوائش اور کھجور کا شیک

9۔ایک قرآن پاک کبھی دو۔۔اللہ تعالٰی توفیق دے 10۔ بچوں کی روزہ کشائی کبھی نہیں کی خود ہی روزہ رکھنا شروع ہو گئے۔۔

11۔اپنے عزیزوں اور جاننے والوں کو ہی دیتے ہیں۔۔ 12۔رجب اور شعبان میں ہی تیاری کر لیتے ہیں رمضان المبارک میں بازار نہیں جاتے۔۔

13۔ زیادہ تر سلواتے ہیں لیکن بنے بنائے اور آن لائن بھی لے لیتے ہیں۔ 14۔ سوشل میڈیا پر ٹائم کم ہوجا تا ہے۔

15۔ عام دنوں میں بھی خبروں کے علاوہ ٹی وی نہیں دیکھتی رمضان المبارک میں بھی سحری اور افطار کے لئے ٹی وی آن کرتے ہیں۔۔

16۔ ملک کی ترقی، امن وامان، اپنی، گھر والوں اور تمام مسلمانوں کی عافیت اور مغفرت کی دعائیں۔۔رزق اور روزگار میں برکت۔۔ناگہانی آفات ناگہانی حادثات اور ناگہانی اموات سے اللہ تعالٰی ہم سب کو محفوظ رکھے آمین۔۔ 17۔ شکرانے کے نوافل گھر میں ادا کرتی ہوں۔ 18۔واٹس ایپ پر عید مبارک کے پیغامات بھیجتے ہیں اور بہت قریبی عزیزوں کے گھر جاتے ہیں یا پھر جو بلا لیتے ہیں ان کے گھر چلے جاتے ہیں۔۔ 19۔ سمندر پار بچوں اور عزیزوں سے آڈیو اور وڈیو دونوں طرح سے بات ہوجاتی ہے۔۔

20۔ جی ہمارے علاقے کی مسجد میں اور مین روڈ پر باقاعدہ افطار کا اہتمام کیا جا تا ہے۔

کپڑے کبھی آن لائن نہیں۔۔۔

یاسر فاروق (کراچی)

۱۔تیسری کلاس میں ۲۔چھٹی کلاس سے 3۔تراویح ۲۰ والی .4موبائل سے ۵۔جی سب اکٹھے ہوتے ہیں۔شربت، پکوڑے اور دہی پھلکیاں لازمی
کم ازکم ایک ۶۔جام شیریں۔پکوڑے، دہی پھلکیاں، اور پھل ۷۔بدلتے ہیں .8 گھر میں ۹۔منعقد کرتے رہے ہیں۔سوشل میڈیا پر نہیں دی۔
۱۰۔دونوں کو۔ ۱۱۔کوئی خاص تیاری نہیں کرتے۔ ۱۲۔کبھی بنوالئے۔کبھی ریڈی میڈ۔آن لائن نہیں لیے۔ ۱۳۔کمی ہوگی۔ ۱۴۔ٹی وی نہیں دیکھتے ۱۵، یاخدا میرے ملک کی
حفاظت فرما ۱۷۔اب قریبی مسجد میں ۱۸۔دور والوں کو وٹس ایپ پر۔قریبی کو ملنے جاتے ہیں ۱۹۔دونوں ۲۰۔بالکل ہوتا ہے۔

الحمدللہ کسی بھی قسم کی نشریات دیکھنے سے گریز کرتے ہیں

شربت سب کو روح افزا ہی پسند ہے

حافظہ حفصہ عبدالرحمٰن (آن لائن قرآن ٹیچر)

ا۔پہلا روزہ آٹھ سال کی عمر میں رکھا تھا۔ 2۔دس سال کی عمر میں مکمل روزے رکھنا شروع کیے۔ 3۔تیس روزہ تراویح پڑھتے ہیں۔
4۔موبائل الارم سے۔ 5۔تقریباً سبھی اکٹھے ہوتے ہیں اور کھانے کے ساتھ، پھینیاں بھی ہوتی ہیں
6۔اوقات کار عموماً نہیں بدلتے۔ 7۔افطار ہمیشہ گھر میں ہی ہوتا ہے۔ 8۔دسترخوان پر افطار کی روایتی کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔فروٹ چاٹ، چھولوں کی چاٹ، دہی بڑے، فرائی آئٹمز اور شربت تو روح افزاء ہی پسند ہے سب کو۔ 9۔رمضان میں قرآن جتنا پڑھتے ہیں ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔10۔روزہ کشائی کی مختصر تقریب کی کوشش ہوتی ہے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے۔مگر تصویریں ڈالنا سوشل میڈیا پر بالکل نہیں پسند۔ 11۔فلاحی ادارے+ کچھ جاننے والے سفید پوشوں کو 12۔رمضان سے پہلے شروع کر دیتے ہیں تاکہ رمضان کی عبادات میں مشکل نہ ہو۔
13۔کبھی سلواتے ہیں اور کبھی سلے لیتے ہیں۔ 14۔سوشل میڈیا کا وقت کافی کم ہوتا ہے۔ 15۔الحمدللہ کسی بھی قسم کی نشریات دیکھنے سے گریز کرتے ہیں۔
16۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متحد کریں اور نیک حکمران نصیب کریں۔ 17۔گھر کے مرد قریبی مسجد میں ادا کرتے ہیں۔18۔واٹس ایپ پر مبارکباد دیتے ہیں اور قریب رہنے والوں سے ملنے جاتے ہیں۔
19۔بیرون ملک/شہر رہنے والوں سے آڈیو کال پر بات ہوتی ہے۔ 20۔بہت اہتمام ہوتا ہے۔

بیرون ملک رشتہ داروں سے وڈیو کال ہوتی ہے

عشرت شاہین ایڈووکیٹ (کراچی)

1... 4سال کی عمر میں پہلا روزہ رکھا۔ 2۔ الحمداللہ 6سال کی عمر سے پورے روزے رکھنا شروع کیے۔ 3۔ 20رکعات۔
4۔۔ سحری خود اٹھ جاتی ہوں الارم کی ضرورت نہیں پڑتی، رمضان کے علاوہ بھی یہی عادت ہے۔ 5۔ سب چیزیں ہوتی ہیں۔پراٹھے ۔دھی۔میں سحری ہلکی پھلکی کرتی ہوں
6۔۔ سب اوقات کار بدل جاتے ہیں۔ 7۔۔ افطاری گھر پہ کرتی ہوں 8۔پکوڑے فروٹ چاٹ اور کھانا، شربت، خاندان والے ،مگر میں پانی اور سادہ کھانا۔
9۔۔ پہلے تو 3 سے 4 تکمیل قرآن پاک ہوتا تھا مگر اب ترجمہ تفسیر سے بمشکل ایک بار ہی تکمیل ہو پاتی ہے۔ 10۔۔افطار سپیشل ہی ہوتا ہے الگ سے تقریب نہیں ہوتی۔

سوشل میڈیا پر کچھ نہیں پوسٹ کیا جاتا۔ 11۔رشتہ داروں کو دوستوں اور اداروں کو بھی۔زکوۃ سے زیادہ ادا کیا جاتا ہے۔الحمدللہ۔12۔رمضان المبارک سے قبل ہی سب کے لیے نئے کپڑے خرید لئے جاتے ہیں تا کہ رمضان میں وقت ضائع نہ ہو۔ 14۔۔ نئے کپڑے سلواتے ہیں۔ 15۔ وقت کا ضیاع ہے۔نہیں دیکھتے۔16۔ اللہ کریم عبادات قبول فرمائے اور اپنے گھر کا مہمان بنالے۔آمین 17۔ میں نماز عید نہیں ادا کر پاتی بوجوہ گھریلو ذمہ داریاں۔ 18۔ واٹس اپ مسیجز۔کالز اور کچھ سے ملاقات تحائف کا تبادلہ۔19۔جی بیرون ملک رشتہ داروں سے وڈیو کال ہوتی ہے۔

20۔جی الحمداللہ مسافروں کے لیے سرراہ افطاری کا اہتمام ہوتا ہے۔

ٹی وی پروگرام اجتماعی اعمال میں رکاوٹ

قیصرزبیری۔جھنگ

۱۔پہلا روزہ نو دس سال کی عمر میں رکھا۔ ۲۔اوائل جوانی میں پورے روزے رکھنا شروع کیئے۔ ۳۔بیس رکعت تراویح ۲۹ یا ۳۰ رمضان تک۔ ۴۔سحری کے لئے موبائل پر الارم ۵۔سحری سب اکٹھے کھاتے ہیں۔پراٹھے سالن،دہی،گھی شکر،چائے۔ ۶۔میں رٹیائرڈ ہوں،بچوں کی ملازمتوں کے اوقات کار بدل جاتے ہیں۔ ۷۔افطاری گھر پر،سب اکٹھے ۸۔کھجور،فروٹ چاٹ،پکوڑے،دودھ سوڈا،شربت بادام/الائچی۔ ۹۔تین بار قرآن پاک مکمل کرتے ہیں۔ ۱۰۔بچوں کی روزہ کشائی کی تقریب نہیں ہوتی۔ ۱۱۔زکوٰۃ غریب اقرباء معلوم مستحقین،مرکز نابینا،دینی مدارس کے سفیروں کو ۱۲۔نیا جوڑا رش سے بچنے کیلئے رمضان سے پہلے ۱۳۔کپڑے خود سلواتے ہیں۔ ۱۴۔سوشل میڈیا کو کم وقت ۱۵۔ٹی وی چینلز کے دینی پروگرام انفرادی،اجتماعی اعمال میں رُکاوٹ،ویسے ہمارے گھر ٹی وی نہیں ہے۔ ۱۶۔امام صاحب کی اقتدا میں آمین۔ ۱۷۔قریبی مسجد میں نمازِ عید ۱۸۔قریب والوں کو ملنے جاتے ہیں،دور والوں کو فون کر کے یا واٹس ایپ میسج سے عید مبارک ۱۹۔سمندر پار کوئی عزیز یا دوست نہیں رہتا۔ ۲۰۔شہر میں غریبوں،عام شہریوں،مسافروں کو سرِ راہ افطاری کراتے کسی کو نہیں دیکھا۔

ٹی وی پروگرام دیکھنے میں کمی کریں گے۔۔۔

مبشرھاشمی۔جھنگ

۱۔دس سال کی عمر میں
۲۔گیارہ سال کی عمر میں
۳۔۲۰ تراویح
۴۔موبائل کے الارم سے
۵۔سب مل کر اور عام روٹن کا کھانا
۶۔بدلتے رہتے ہیں
۷۔گھر
۸۔کھجور،دودھ شربت،لسی
۹۔کبھی گنتی نہیں کی۔
۱۰۔کوئی تقریب منعقد نہیں کرتے۔
۱۱۔فلاحی اداروں،عزیز محلہ دار
۱۲۔عید کی تیاری آخری عشرے میں
۱۳۔نئے کپڑے سلواتے ہیں۔
۱۴۔کمی کریں گے انشاء اللہ
۱۵۔عبادتوں میں خلل ہے
۱۶۔اللہ ہماری سب کی بخشش فرمادے
۱۷۔قریبی مسجد میں
۱۸۔واٹس ایپ اور کچھ کو ملنے جانا
۱۹۔آڈیو اور وڈیو پیغام
۲۰۔کہیں کہیں اور کبھی کبھی

ٹی وی پروگرام عبادت نہیں ہیں، ہم نہیں دیکھتے

رمضان سے تیاری شروع ہوتی ہے۔ آخری عشرہ

کاشف سومرو۔ کراچی

1۔6سال کی عمر میں　2۔9یا10 سال کی عمر میں　3۔27روزہ　4۔مختلف طریقوں سے　5۔سب اکٹھے اٹھتے ہیں　6۔اوقات بدل جاتے ہیں
7۔گھر میں　8۔پھل، شربت، کوئی سالن اور میٹھا　9۔کچھ پارے　10۔نہیں کرتا۔　11۔خاندان کے مساکین کو
12۔رمضان سے تیاری شروع ہوتی ہے۔ آخری عشرہ　13۔سلواتے بھی ہیں اور بنے بنائے خریدتے بھی ہیں۔　14۔کمی کریں گے۔

ٹی وی پروگرام عبادت میں خلل نہیں

نہ یہ عبادت میں شمار ہوتا ہے نہ ہم دیکھتے ہیں

انجینئر خالد عمر۔ لاہور

15۔نہ یہ عبادت میں شمار ہوتا ہے نہ ہم دیکھتے ہیں۔　16۔اللہ تعالی ہمارے روزوں کو قبول فرمائے اور ہماری مغفرت فرمائے۔ یہ دن بار بار دکھائے۔
17۔قریبی مسجد　18۔وٹس ایپ اور ملنے جانا　19۔آڈیو یا میسج　20۔بلکل ہوتا ہے۔
1۔۔1962 میں　2۔۔1964 میں　3۔۔30روز　4۔۔ٹائم پیس　5۔۔جی ہاں۔ پراٹھا۔ سالن۔ دہی۔ چائے
6۔۔بدلتے ہیں　7۔۔گھر　8۔۔کھجور۔ پکوڑے، شربت۔ جام شیریں　9۔۔ایک　10۔۔جی ہاں　11۔۔دونوں کو
12۔۔10ویں روزے سے۔　13۔۔سلواتے ہیں　14۔۔کم وقت　15۔۔خلل نہیں۔
16۔۔بزرگوں کے لیے اچھی صحت، اپنے اور بچوں کے لئے صحت، سلامتی اور رزق حلال　17۔۔قریبی مسجد　18۔۔واٹس ایپ مبارک باد۔ ذاتی ملاقات
19۔۔دونوں　20۔۔جی، ہوتا ہے۔ مسجد اور مدارس میں

رمضان کی برکتیں اور عید کی مسرتیں

اختر علی مغل (سڈنی، آسٹریلیا)

9سال کی عمر میں، میں جب ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا1982۔ پہلے ٹائم پیس الارم سے جاگتے تھے پھر موبائل آ گئے۔ لہٰذا اب ٹائم پیس کی ضرورت نہیں رہی تو موبائل کے الارم سے جاگتے ہیں۔ پہلے تو کوئی بہت خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا سحر میں اب لیکن کھجلہ پھینی ہوتی ہے۔ اوقات کا بدلتے رہتے ہیں۔ عموماً تو گھر پر اور کبھی کبھار ٹرین میں سفر کے دوران یا یونیورسٹی میں جہاں بھی ہوں وہیں افطار کر لیتے ہیں۔ چنے کی چاٹ، فروٹ چاٹ، پکوڑے وغیرہ ہوتے ہیں جام شیریں اور روح افزا کا شربت استعمال ہوتا ہے۔ پہلے تو دو بھی ہو جاتے تھے لیکن اب ایک ہی ہو پاتا ہے وہ بھی کسی رمضان میں۔ نہیں اس کا کوئی باقاعدہ اہتمام نہیں کرتے اور نہ ہی سوشل میڈیا پر تصویر رکھتے ہیں۔ پاکستان میں تو آس پاس کے غریب اور ناداروں کو دیتے تھے مگر اب یہاں پردیس میں فلاحی اداروں کو دیتے ہیں یا بھائیوں کو بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ آس پاس کے مستحقین کو دے دیں۔

یہاں پردیس میں رہتے ہوئے تو عید کی اس طرح سے تیاری نہیں ہوتی جس طرح پاکستان میں ہوا کرتی ہے یہاں رہتے ہوئے صرف یہ پلان کرنا ہوتا ہے کہ عید کی نماز کہاں پڑھیں گے پھر چھٹی کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ دوست احباب شام کو ملنے جلنے کا اہتمام یا ڈنر کا بندوبست کر لیا جاتا ہے۔

یہ وہی بات ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے تو نئے کپڑے خود سلواتے تھے یہاں پردیس میں رہتے ہوئے اس طرح کا کوئی اہتمام نہیں کرتے اور یہ بھی کہ جو شلوار قمیض پاکستان سے لائے ہوتے ہیں عید و تہوار پر وہی زیبِ تن کرتے ہیں۔ رمضان کے دوران روزمرہ کی مصروفیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کمپیوٹر اور موبائل کا استعمال کم کر دیتے ہیں۔

میرے خیال میں تو ان کا دیکھنا تو عبادت میں شمار نہیں ہوتا اور ہم نا ہی ہم دیکھتے۔ عالمی امن اور خوشحالی جب مکمل ہوتی ہے جب ہمارے آس پاس غریب و نادار بھی عید منائیں

پاکستان میں تو عید کی نماز ادا کرنے جایا کرتے تھے جب سے یہاں آسٹریلیا آئے ہیں تو کسی بڑھے پارک میں یا پھر مسجد میں چلے جاتے ہیں جہاں بھی عید نماز کا اہتمام ہو۔

اب صرف واٹس ایپ پر عید مبارک کہنا رہ گیا ہے اور یہاں عید کی چھٹی تو ہوتی ہی نہیں تو اس لئے ملنے جانا بھی ممکن نہیں ہوتا البتہ عید کے آس پاس کے جو ویکینڈ ہیں اس پر کوئی ملنے جلنے کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ صرف واٹس ایپ پر یا فیس بک پر کیا عید مبارک کے پیغامات دیئے جاتے ہیں۔ فیملی کے ساتھ ویڈیو کال پر بات ہوتی ہے۔

پاکستان میں تو ہوتا تھا لیکن یہاں صرف دوست احباب دعوت افطار کرتے ہیں اور ان ہی سے ملنا جلنا رہتا ہے۔

''پاکستان لائبریری'' کا وطنِ عزیز میں قیام

101 کتب جن کی مالیت دولاکھ روپے ہے صرف تیس ہزار روپے (Rs:30,000) میں حاصل کریں۔ پاکستان لائبریری کے نام سے اپنے گھر، محلے، گاؤں، ہسپتال، جیل خانہ جات، کالونی، سکول، کالج، یونی ورسٹی میں اور اپنی اپنی مادرِ علمی میں، اپنے والدین، قومی ہیروز اور اپنے پیاروں کے نام پر یہ کتب خرید کر لائبریری قائم کریں۔

نوٹ: 100 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے۔

قدم بڑھائیں، لائبریری بنائیں
کتابیں ایک سو ایک، مقصد اعلیٰ اور نیک

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

ای میل: qalamfoundation2@gmail.com 0300-0515101 / 0309-4105484

شائستہ اکرام اللہ مسجد نبوی میں

ڈاکٹر سید جعفر احمد کی کرم فرمائی کہ رمضان کی آمد کا سوچتے ہوئے انہوں نے شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی ایک تصنیف میں مسجد نبوی میں جمعتہ الوداع' کی تحریر پڑھی تو اسے ماہنامہ 'اطراف' کے لیے موزوں خیال کرتے ہوئے عنایت کی۔ شائستہ سہروردی اکرام اللہ تاریخ پاکستان کی عظیم شخصیت ہیں۔ ان کی تصنیفات اُردو کلاسیک میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

اللہ اللہ خوش نصیبی۔ مسجد نبوی میں جمعتہ الوداع کی نماز

اُردو کی ممتاز مصنّفہ شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی تحریروں سے انتخاب

جون ۱۹۷۰ء

میں اور بارگاہ رسالت پناہ کی
اے دل کہیں نہ ہو یہ غلطی نگاہ کی

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سبز گنبد نظروں کے سامنے تھا۔ آنکھیں دیکھ رہی تھیں لیکن دل کو یقین نہ آتا تھا کہ اس در کی بازیابی پھر نصیب ہوگی۔

عمرہ سے دل کو مجلّا اور خانہ کعبہ کے دیدار سے آنکھوں کو روشن کر کے ہم لوگ سحری کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہو گئے تھے تا کہ جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں ملے۔ صبح کی نماز راستہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑھی۔ نور ظہور کا وقت تھا۔ دل پر عجیب اثر ہوا۔ خیال آیا کہ سرور کائنات کفار کے ظلم سے بچنے کے لیے اس راستے سے گزرے ہوں گے۔ پھر مکہ کی شاندار فتح یاد آئی۔ اس کے بعد مسلمان قوم کی موجودہ زبوں حالی یاد آئی اور دل نے کہا کہ:

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

کوئی ساڑھے دس گیارہ بجے تک مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ ہوٹل میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور گیارہ بجتے بجتے مسجد نبوی کے زنانہ حصے میں حاضر ہو گئے۔ لیکن اتنے سویرے بھی مسجد کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ رمضان شریف کا مہینہ، جمعتہ الوداع کا دن۔ شمع رسالت کے پروانے دنیا کے ہر حصے سے آ کر جمع ہوئے تھے۔ ہم لوگ مشکل

مکّے کی شاندار فتح یاد آئی پھر مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی

سے جگہ لے سکے اور خوش نصیبی سے گنبد کے بالکل ہی مقابل مسجد کے صحن میں تھوڑی سی جگہ مل گئی۔

میرے ساتھ مراکش کے کونسلر کی بیوی تھیں جن سے میرے پرانے مراسم تھے۔ خوش قسمتی سے وہ اور اُن کے شوہر بھی اُسی وقت عمرہ کے لیے جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ ہونے سے بہت سہولت رہی۔

مسجد نبوی بھرتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف عورتیں اوراد و وظائف اور نفل پڑھ رہی تھیں۔ مگر افسوس چند ایک ایسے موقع پر بھی سخت کلامی اور قریب قریب لڑنے تک سے احتراز نہ کرسکیں۔ دیر سے آنے والیاں پہلے سے بیٹھی ہوئی عورتوں سے کہہ رہی تھیں" اے ہٹو نا کیا ساری مسجد تمہاری ہے۔'وہ جواب دے رہی تھیں" ارے اتنا شوق تھا تو ذرا سویرے کیوں نہیں آئیں۔ یہ مقام اور ایسی باتیں! اور یہ دیکھ کر اور بھی افسوس ہو رہا تھا کہ لڑنے والیاں پاکستانی یا ہندوستانی ہوں گی۔ کیونکہ اُردو بول رہی تھیں اور اپنی طرف کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے اکثر خواتین کے ساتھ تھے۔ چلو مجبوری ہے کس پر چھوڑ کر آتیں؟ لیکن مائیں ان کو جس متبرک مقام پر لائیں تھیں اس کے احترام کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کر رہی تھیں بلکہ جو بیوی خاص طور سے لڑ جھگڑ کر بیٹھی تھیں بلا تکلف باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے صاحبزادے جو پانچ برس کے تو ہوں گے اُچک کر میری جانماز پر عین سجدے کے مقام پر آ بیٹھے۔ مسلمان گھروں میں تو اس سے بھی کم عمر بچوں کو نماز کے آداب سکھائے جاتے تھے اور وہ کسی کو نماز پڑھتے دیکھتے تو خاموش ہو جاتے۔ اگر وہاں سے جانا ہوتا تو پاؤں دبا کر پیچھے سے نکل جاتے تھے۔

سفر کی سہولت کی وجہ سے شیدایانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دوسرے لوگ بھی بطور سیر کے ان مقامات پر پہنچ جاتے ہیں۔ خیر وہاں سے آ کر اپنوں کی غیبت مناسب نہیں۔

نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ دلوں کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ اللہ اللہ کیا خوش نصیبی ہے۔ خدا تعالیٰ کا کس درجہ کرم ہے۔ مسجد نبوی اور جمعتہ الوداع کی نماز! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرکار میں حاضری اور وہ بھی رمضان کے مبارک مہینے میں اور پھر آخری جمعہ کے متبرک دن میں! کیا خوش نصیب تھے وہ لوگ جو آج یہاں حاضر تھے۔

موذّن نے اذان دی۔ مقتدی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ چند منٹوں میں نماز جمعہ ختم ہو گئی پھر سنتیں اور نفل پڑھے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ باہر نکلے۔ اب تک روضہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار سے آنکھیں روشن نہیں کی تھیں۔ مسجد کے اس حصے کے دروازے پر پہنچے جہاں روضہ اقدس ہے۔ پہلے تو کہا گیا کہ ابھی عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں، کافی انتظار کے بعد جانے کی اجازت ملی۔

چونکہ آج جمعتہ الوداع کا دن تھا اور یہ معلوم تھا کہ رسولِ عربی کے شیدائی پروانوں کی طرح مزار مبارک پر گریں گے۔ آدھ آدھ گز بلکہ

مسجد نبوی میں لڑنے والی اُردو بول رہی تھیں

اس سے بھی کم فاصلے پر سپاہی کھڑے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا مزار رسول کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ زائرین کو درشتی اور بے رُخی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب گاہ کی زیارت سے روک رہے تھے جس کی شکایت میں پہلے کر چکی تھی۔ مگر افسوس کہ حالت ویسی بلکہ اس سے زیادہ خراب تھی۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا یہ جانتے

ہوئے کہ آج کے دن لوگ والہانہ مزار رسول کو آنکھوں سے لگانے اور چومنے کی کوشش کریں گے۔ پہرہ بہت سخت تھا۔ دور سے کھڑے ہو کر شاہ مدینہ کے دربار میں سلام پڑھا اور ایک بار پھر بچپن کے زمانے میں میلاد کے سنے ہوئے اشعار یاد آنے لگے اور دل چاہا کہ روضہ مبارک کی جالی سے لپٹ کر کہوں کہ

رنج و غم کھائے ہوئے ہیں دور سے آئے ہوئے ہیں
تم پہ اترائے ہوئے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں
یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک صلوٰۃ اللہ علیک

مگر اس کی اجازت کہاں تھی! دل بھرا کا بھرا رہ گیا اور چشم پر نم دور سے دُرود و سلام پڑھتے دو ہوئے باہر نکل آئے۔

گزشتہ دفعہ جنت البقیع کی زیارت سے بالکل ہی محروم رہ گئی تھی کیونکہ عورتوں کو اندر جانے کی قطعی اجازت نہیں ہے اور چار دیواری اس قدر اونچی ہے کہ باہر سے کچھ نظر نہیں آتا۔ بعد میں کسی نے کہا کہ آس پاس کے گھر والوں میں پاکستانیوں کا گھر ہے اور وہ از راہ مہربانی اپنی چھت سے شائقین کو اس خطہ زمین کی ایک جھلک دیکھ لینے دیتے ہیں جس میں اسلام کے سب سے زیادہ درخشندہ ستارے تہ خاک ہیں۔ میں نے کہا کہ بغیر ان کی ایک جھلک دیکھے ہرگز واپس نہ جاؤں گی۔ مگر موکل نے جو خود بھی وہابی ہی ہوگا، کسی مکان کی تلاش میں میری ذرا بھی مدد نہیں کی۔ وہ جنت البقیع کے مقفل دروازے پر بد دلی کے ساتھ سلام پڑھ کر واپس جانا چاہتا تھا مگر میں مصر ہوئی کہ میں تو آس پاس کے کسی نہ کسی گھر سے جنت البقیع کو دیکھوں گی۔ گزشتہ چار پانچ سال میں بھی کافی فرق ہو گیا ہے اور کوئی گھر قریب نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن ایک اونچی سی عمارت قریب نظر آئی اور میں نے خود موٹر سے اتر کر اُس کے اندر جا کر چھت پر جانے کی اجازت چاہی۔ یہ ایک ہوٹل تھا۔ ہوٹل والا یا دربان جو کوئی بھی تھا اُس نے کچھ تامل کے بعد اجازت دے دی اور میں اوپر چلی گئی۔ یہ چار یا پانچ منزلہ عمارت تھی اور یہاں سے قبرستان جنت البقیع بہت صاف نظر آتا تھا۔ کافی وسیع زمین ہے۔ مگر اب صرف چٹیل زمین کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہیں کہیں شکستہ پتھر لگے ہوئے تھے جن سے یہ خیال ہوتا کہ یہ قبروں کی نشانیاں ہیں۔ سارے قبرستان میں کوئی تھیں چالیس یا شاید اس سے زیادہ پتھر کہیں دور دور لگے ہوئے تھے۔ اُن پر نہ نام لکھا تھا نہ کوئی اور شناخت کا نشان کہ پتا چلے کہ کس کی قبر ہے۔ ان قبروں میں جگر گوشہ رسول بی بی فاطمہ زہراؓ کی قبر تھی۔ لخت دل مصطفےٰ امام حسن کی قبر تھی۔ عشرہ مبشرہ کے بیشتر صحابہ کی قبریں تھیں۔ اسلام کے دور اول کے سارے ناموروں کی قبریں یہاں ہی تھیں اور بعد میں بھی اس خطہ زمین میں جگہ پانا جنت ملنے کی دلیل تھی۔ اس خطہ زمین کو جس کے متعلق حالی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

اس زمین کی ایسی بے حرمتی ہوئی کہ دنیائے اسلام دیکھا کی

کمزور رفتہ رفتہ ایمان ہو گیا
کہ اب جنت البقیع بھی ویران ہو گیا

خیر اس پاک زمین کی جھلک تو نظر آ گئی ورنہ اپنی محرومی کا بہت افسوس تھا۔

یہاں سے واپس ہوتے ہوتے عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ پھر مسجد نبوی میں نماز پڑھی اور ہوٹل واپس ہوئے۔ دل تو چاہتا تھا کہ آج کا تمام

جنت البقیع دیکھنے کی خواہش ایک ہوٹل کی چھت سے پوری کی

دن اسی آستانے پر بیٹھ کر گزار دیں۔ لیکن آپریشن نے طاقت ختم کر دی تھی اور روزے کی تکان زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ہوٹل آ کر کچھ دیر کو آرام کیا۔ افطار کے بعد مغرب کی نماز کے لیے مسجد گئے۔ واپس آ کر کھانا کھا کر عشاء کے بعد ہمیزہ اور میں رات کا کچھ حصہ مدینہ میں گزارنا چاہتے تھے۔ کیونکہ مدینہ منورہ میں یہی رات لیلتہ القدر تھی اور منائی جا رہی تھی۔ اُن کے حساب سے ستائیسویں کی شب اُسی روز پڑتی تھی۔

لیکن ہمیں بتایا گیا کہ عشاء کی نماز کے بعد رات بھر تہجد گزاری ہوگی اور جا کر پھر آنا ممکن نہ ہوگا۔ ہمزہ کی صحت بھی ہمیشہ سے کمزور ہے اور اپنے پھول سے بچے کے گزرنے کے بعد حال میں کافی بیمار رہی ہے۔ اس لیے ہم لوگ اس کی ہمت نہ کر سکے اور اپنے ہوٹل کے سامنے کے برآمدے میں عشاء کی نماز اور وظائف پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ برآمدے سے گنبد خضرا صاف نظر آتا تھا۔ مسجد نبوی کا دروازہ بھی مد مقابل تھا۔ کھانے کے بعد ہم اپنی جانمازیں اور قرآن شریف لے کر برآمدے میں آئے۔ اُس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ اس کو خیال سمجھیے یا عالم تصور۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک دم سے فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہر چیز رک گئی، شب معراج

میں نے دیوانہ وار جالی سے لپٹ کر آنکھیں روشن کر لیں

کے متعلق جو میلادوں میں بچپن میں سنا تھا کہ

ہوا سے کہہ دو کہ نہ چلے آج کی رات
اور پانی سے کہہ دو نہ بہے آج کی رات

وہی کیفیت طاری تھی۔ جیسے فطرت کی ہر چیز تھم گئی ہو۔ جیسے کہ آسمان اور زمین اور اُن کی ہر شے اپنے خالق کے آگے سر بہ سجود ہو گئی ہو۔ اُس وقت کا عالم بیان سے باہر ہے۔ خداوند کریم کا یہ فضل! ایک گناہ گار کو ایسی مبارک شب دیار نبی ﷺ میں گزارنا نصیب ہوا۔ زخم دل بھر گئے اور قلب مضطر کو سکون آ گیا۔

دل چاہتا تھا کہ ساری رات اسی محویت کے عالم میں گزار دوں مگر کمزور جسم میں سکت نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہو کر کوئی ایک ڈیڑھ بجے کے قریب اُٹھے اور کمرے میں جا کر سو گئے۔

سحری کے بعد ہمیزہ اور میں مسجد نبوی میں پھر حاضر ہوئے۔ صبح کاذب کا پر اثر وقت تھا۔ چاروں طرف لوگ عبادت میں مصروف تھے۔ ہاتھ استجاب دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے بھی اپنی جانمازیں بچھائیں اور روداد غم اس دربار میں دل ہی دل سنانے لگے۔ رات کی سیاہی چھٹ رہی تھی، صبح صادق شروع اور یہ مبارک رات ختم ہو رہی تھی۔ اذان کی آواز نے گویا دل پر ضرب لگا دی۔ کانپتے ہوئے پاؤں اور دھڑکتے ہوئے دل لے کر نماز کو کھڑے ہوئے۔ نماز کے بعد امام نے بڑی موثر دعا پڑھی اور اس طرح لیلتہ القدر کی مبارک شب ختم ہوئی۔

ہوٹل واپس آ کر پھر کچھ دیر آرام کیا۔ میں بہت جلد جاگ گئی۔ روضہ اقدس سامنے تھا۔ دل ایک دم پھر دیدار کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن معلوم تھا کہ اکیلے گئی تو داخل نہ ہونے دیں گے۔ ہمیزہ کے شوہر اور ان کے ساتھی چونکہ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ کوئی دس بجے کے قریب میں تو تیار تھی ان لوگوں کو تیاری میں کچھ وقت لگا۔ پھر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہو کر الوداع کے لیے دربار رسول میں حاضر ہوئے۔ اس وقت جو دل کی کیفیت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی سب سے عزیز ترین چیز چھوٹ رہی ہے۔ موکل نے وعدہ کیا تھا کہ آج روضہ رسول کو ایک دفعہ آنکھوں سے لگانے کا موقع دلانے کی کوشش کرے گا لیکن وہ موجود نہ تھا۔ میں نے خود دیوانہ وار جالی سے لپٹ کر آنکھیں روشن کر لیں۔ قبل اس کے کہ نجدی سپاہی کی خشمگیں نظریں مجھ پر پڑیں، ایک اور موکل نے سلام پڑھا۔ دل بھر آیا۔ آنکھ میں آنسو آ گئے اور دربار رسالت سے یہ دعا کرتے ہوئے رخصت ہوئے کہ:

ہے یہ حسرت پھر در پر آئیں اشک کے دریا بہائیں
داغ سینے کے دکھائیں سامنے ہو کر سنائیں
یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک صلوٰۃ اللہ علیک

ایک عجیب بات ہے اور یہ میں نے اوروں سے سنی ہے کہ جتنی مرتبہ دربار رسالت میں جاؤ، کشش اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ حالانکہ اور جگہوں کو اگر ایک دفعہ دیکھ لیا تو دل بھر جاتا ہے اور پھر دوبارہ وہاں جانے کی حسرت نہیں ہوتی۔ لیکن شاہ مدینہ کی گلیوں کی کشش کبھی نہیں چھوڑتی۔ یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ اُس بستی کی زیارت نصیب ہو گئی جس کے متعلق میری والدہ بڑی حسرت سے پڑھتی تھیں۔

دکھا دے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولا تری رحمت برستی ہے

ان جیسی نیک بیوی کو روضہ اقدس کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کی محرومی بھی ان کی کڑی آزمائش تھی۔ جس کا اجر اُس دنیا میں اُنہیں ضرور ملا ہوگا۔ دربار نبوی ﷺ کی کشش بھی اُن کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ۞

حیدرآباد دکن سے افروز رئیس اختر

"رمضان المبارک ایک بابرکت مہینہ ہے جو عبادت، تقویٰ صبر شکر اور قربانی کا درس دیتا ہے۔
آپ کے سوالات نہایت خوبصورت ہیں اور ان کا جواب دینے میں مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔"

سحری میں کھچڑی گھی، تل کا کھٹا دم کا قیمہ، تلا ہوا گوشت ضروری

افروز رئیس اختر............... حیدرآباد دکن، انڈیا

1: پہلا روزہ آپ نے کب رکھا تھا؟
بچپن کی وہ معصوم سی خوشی یاد ہے آج بھی جب پہلا روزہ رکھا رمضان کریم میں سب کو دیکھ کر گو کہ شعور نہیں تھا بس خوشی تھی کہ روزہ ہیں ہم بھی افطار کے وقت سب بڑوں کی محبت یاد ہے کہ کتنا خوش ہوے تھے سب

2۔رمضان کے پورے روزے کب سے رکھنا شروع کیے؟
الحمداللہ میں نے بچپن میں ہی روزے رکھنا شروع کردیے تھے لیکن جب شعور آیا رمضان کریم کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی تب سے پورے روزے رکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے الحمداللہ یہ عبادت دل کا سکون اور روح کی تازگی ہے۔

تراویح کی بیس رکعت پڑھنے کی کوشش

3 تراویح کتنے روز والی ادا کرتے ہیں؟
الحمدللہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ پورے ماہ رمضان کریم میں تراویح ادا کروں تراویح کی بیس رکعت پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں کیونکہ یہ رمضان کریم کی برکتوں کو سمیٹنے کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے۔

4 سحری کے وقت موبائل کے الارم سے۔ٹائم پیس کے الارم سے جاگتے ہیں۔یا ڈھول بجانے والوں کی آواز پر؟
احتیاط کے طور پر موبائل کا الارم لگاتے ہیں کیونکہ یہ بہت سہل اور موثر ذریعہ جاگنے کا ویسے بھی ہمارے یہاں کوئی نہ کوئی جاگتے ہی رہتے ہیں سحر تک لیکن بچپن کے وہ لمحے آج بھی ذہن کے گوشہ میں تازہ ہیں جب سحری میں جگانے کے لیے ڈھول بجائے جاتے تھے اور نعت شریف پڑھتے ہوے بھی سائل جگانے آتے یہ بھی ایک رمضان کریم کی خوبصورتی رہی

5۔سحری پر سب اکٹھے ہوتے ہیں کیا کیا دسترخوان پر ہوتا ہے۔کھجلہ۔پھینی بھی؟
سحری کے وقت گھر کا ہر فرد ایک ہی دسترخوان پر ہوتا ہے سب اکھٹے ہوکر سحری کرتے ہیں ہر روز سحر میں مختلف قسم کی ڈشز بنتی ہیں لیکن دکن حیدرآباد میں خاص کر سحر میں کھچڑی گھی تل کا کھٹا دم کا قیمہ اچار دہی پراٹھا اور تلا ہوا گوشت ضرور ہوتا ہے اور ہر ہوٹل میں اس کا خاص انتظام ہوتا ہے کھجور لازمی رکھے جاتے ہیں اور آخر میں گرما گرم چائے اس طرح خوشگوار لمحات میں سحری کی جاتی ہے۔

6۔اوقات کار بدلتے ہیں۔یا وہی رہتے ہیں؟
رمضان میں اوقات کار کچھ حد تک بدل جاتے کیونکہ افطار اور سحری کے اوقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے معمولات میں تبدیلی لانا ضروری ہوتا ہے

7 افطار گھر میں۔دفتر میں یا مسجد میں؟
گھر میں ہی افطار کرتے ہیں جہاں اپنے پیاروں کے ساتھ مل کر روزہ کھولنے کی خوشی الگ ہی ملتی ہے

8: افطار کے لیے دسترخوان پر کیا سجا ہوتا ہے؟ کونسا شربت پسند کرتے ہیں؟
الحمداللہ افطار میں سب کی اپنی اپنی من پسند چیزیں بنی ہوتی ہیں لیکن افطار کے دسترخوان کی زینت ان سب کے بنا ادھوری ہے کھجور پکوڑے چھولے سموسے، وتج رول، فروٹ چاٹ فرینچ فرائز حلیم اور جو بھی موسمی پھل ہیں مشروبات میں پسندیدہ شربت روح افزا ہے جو افطار کی تازگی کو دوبالا کردیتا ہے۔

۔9 رمضان کے مہینے میں کتنے قرآن پاک ختم کرتے ہیں؟
الحمداللہ ایک قرآن پاک ہی مکمل کر پاتی ہوں
کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملے تو یہ سب سے بڑی خوشی کی بات ہے

10۔بچوں کی روزہ کشائی پر کوئی تقریب منعقد کرتے ہیں۔سوشل میڈیا پر اس کی وڈیوز یا تصاویر دیتے ہیں؟
جی ہاں بچوں کے پہلے روزے کی خوشی میں گھر میں ایک مختصر سی تقریب منعقد کی جاتی ہے تاکہ وہ یہ خاص دن ہمیشہ یاد رکھیں زیادہ تر نجی طور پر اس لمحے کو خاص رکھتے ہیں اس لیے سوشل میڈیا پر تصاویر یا ویڈیوز شیئر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

11: زکوۃ فلاحی اداروں کو دیتے ہیں۔یا اپنے غریب عزیزوں یا محلے داروں کو؟
زکوٰۃ دینے میں ترجیح پہلے گھر کے ملازمین ہیں اور جو بھی ضرورت مند

ٹی وی نشریات دیکھنے کی بجائے، قرآن کی تلاوت ترجمہ تفسیر درود شریف کثرت سے

مستحق سائل آتے ہیں ان کو دی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ حصہ فلاحی ادارہ اولڈ ایج ہوم کو بھی دیتے ہیں۔

12۔عیدالفطر کے لیے تیاریاں کب سے شروع کرتے ہیں۔کیا کیا ضروری سمجھتے ہیں؟
عیدالفطر کی تیاریوں میں سب سے ضروری اور اہم کام جو ہے وہ صدقہ فطر کی ادائیگی ہے تاکہ مساکین بھی جلد اپنی عید کی خوشیاں منا سکیں عید کی تیاریاں رمضان کے آخری عشرے میں شروع ہو جاتی ہیں نئے کپڑوں بچوں کے لیے تحائف عید کے لیے خشک میوہ جات کی خریداری اور اسکی تیاری گھر کی صفائی سجاوٹ بھی شامل ہیں

13۔نئے کپڑے سلواتے ہیں۔بنے بنائے خریدتے ہیں۔یا آن لائن منگواتے ہیں؟
کبھی سلوائے جاتے یا پھر ریڈی میڈ بھی خریدے جاتے تھے لیکن اب میں اپنے لیے آن لائن ارڈر کرتی ہوں سکون سے گھر بیٹھے مطلوبہ پسند کے ملبوسات اسانی سے مل جاتے ہیں

14۔رمضان کے دوران سوشل میڈیا کو وہی وقت دیں گے یا کچھ کمی کریں گے؟
رمضان کریم میں سوشل میڈیا کا استعمال میں بہت ہی کم کرتی ہوں تاکہ عبادات ذکرِ الٰہی اور دعا میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جاسکیں

حیدرآباد دکن سے افروز رئیس اختر

15۔رمضان پر ٹی وی چینلوں کی خصوصی نشریات عبادتوں میں خلل ہے یا ان کا دیکھنا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ اگر دیکھتے ہیں تو کس چینل کی نشریات؟

عبادتوں میں خلل نہ ہو تو اسلامی نشریات دیکھی جا سکتی ہیں لیکن میں کوئی بھی ٹی وی کی نشریات نہیں دیکھتی .. یہ دیکھنے کے بجائے قرآن مجید کی تلاوت ترجمہ تفسیر اور درود شریف کثرت سے پڑھنے کو ترجیح دیتی ہوں کیونکہ اس ماہ مقدس کا ہر لمحہ قیمتی ہے اور ثواب بھی زیادہ ملتا ہے

16۔عیدالفطر پر آپ کی دلی دعا کیا ہوگی؟

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ رمضان کریم میں کی گئیں ہماری تمام عبادات دعائیں نیک اعمال قبول ہوں اور ہمیں ہمیشہ رحمتوں اور برکتوں کا طلبگار رکھ اور ہر دل میں خوشی سکون اور شکر گزاری ہو اللہ تعالیٰ سب کے گناہ معاف کرے ہر محروم کو نواز دے رزق میں ترقی دے

امتِ مسلمہ کو اتحاد، امن اور خوشحالی کی دولت سے مالا مال فرما اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما آمین یارب العالمین

17۔نمازِ عید قریبی مسجد میں یا شہر کی عیدگاہ؟

گھر کے سبھی مرد حضرات نمازِ عیدالفطر قریبی مسجد میں ادا کرنے جاتے ہیں۔

بروزِ عید میں اللہ کے حضور نمازِ شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے ماہ صیام میں عبادت کی طاقت دی الحمدللہ

18۔رشتے داروں کو۔ دوستوں کو۔ عید کارڈ بھیجتے ہیں۔ واٹس ایپ پر عید مبارک کہتے ہیں یا ملنے جاتے ہیں؟

حیدرآباد دکن میں مختلف مقامات پر سرراہ افطار کا اہتمام

میں عید پر کسی سے ملنے نہیں جاتی

عید پر جو بھی قریبی رشتہ دار عزیز ہیں ان سے گھر پر ہی ملاقات ہو جاتی ہے

اور عید کارڈ سے بھی آسان طریقہ آج کل جو زیادہ استعمال میں ہے جو بھی دور ہیں انہیں فون کال یا واٹس ایپ کے ذریعہ عید کی مبارکباد دیتی ہوں۔

19۔سمندر پار بچوں۔ عزیزوں سے آڈیو عید مبارک یا وڈیو؟

جی بالکل سمندر پار بچوں اور عزیزوں سے آڈیو وڈیو کال کے ذریعے عید کی مبارکباد دیتی ہوں اس طرح سب کے ساتھ عید کی خوشیوں میں شریک ہو کر دوری کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے اور فاصلوں کے باوجود دلوں کی قربت محبت برقرار رہتی

20۔آپ کے شہر میں مسافروں عام شہریوں غریبوں کے لیے سر راہ افطار کا اہتمام ہوتا ہے؟

جی ہاں الحمدللہ

ہمارے شہر حیدراباد (دکن انڈیا) میں مختلف مقامات پر مسافروں عام شہریوں امیر ہو یا غریب ہر ایک کے لیے سرراہ افطار کا اہتمام کیا جاتا ہے یہ رمضان کریم کا ایک بہت خوبصورت عمل ہے ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ وہ اس کارِ خیر میں حصہ لے یہ رمضان المبارک کی خوبصورت روایات ہیں جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں اور ہمیں اللہ کے قریب ہونے کا موقع دیتی ہیں دعا ہے کہ رمضان کریم ہم سب کے لیے برکتیں اور رحمتیں لے کر آئے

آمین یارب العالمین

لاہور میں استقبالِ رمضان

گروسری اسٹورز میں بیسن کی خریداری بڑھ جاتی ہے

دل کھول کر صدقہ وخیرات۔ منافع خور۔ مہنگے دام

تحریر: سیدہ عطرت بتول نقوی (لاہور)

چونکہ سب مسلمان رمضان کی فضیلت سے اچھی طرح آگاہ ہیں اس لیے مذہبی جوش خروش سے سے استقبال رمضان کیا جاتا ہے سحری افطاری کے لیے انتظامات کیے جاتے ہیں مارکیٹوں میں کھانے پینے کی دکانوں میں کھجوریں سج جاتی ہیں گروسری اسٹورز میں بیسن کی خریداری بڑھ جاتی ہے کیونکہ افطاری میں پکوڑے کھانا پاکستانیوں کی عادت بن گئی ہے فروٹ چاٹ بھی ضروری ہوتی ہے اس لیے فروٹ مہنگے داموں بکتا ہے

اس دنیا میں خیر اور شر ساتھ ساتھ چلتا ہے اس لیے جہاں مخیر حضرات دل کھول کر صدقہ وخیرات کرتے ہیں وکہاں منافع خور چیزوں کے دام بڑھا دیتے ہیں

رمضان المبارک میں ہر کوئی زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے روزے کھلوانے کی چونکہ بہت فضیلت ہے اس لئے افطار پارٹیوں یا افطار ڈنر کے انتظامات بھی کر لیے جاتے ہیں۔

پا فطاری کے وقت روایتی ماحول ہوتا ہے سب گھر والے اکٹھے بیٹھ کر افطار کرتے ہیں، مساجد میں تراویح کے وقت بہت رونق ہوتی ہے، بچپن میں سحری کے وقت جگانے والوں کی آوازیں آتی تھیں اب آغاز رمضان میں ہی الارم سیٹ کر لیے جاتے ہیں

مسلمانوں کی اکثریت خلوصِ دل سے اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے رمضان کا استقبال کرتی ہے تاکہ خلوص نیت سے عبادات کی

افطار پارٹیوں میں ریاکاری اور نمائش سے گیز کیا جائے

جائیں اللہ کی خوشنودی حاصل کی جائے

جہاں کہیں منافع خوری ریاکاری افطار پارٹیوں میں نمائش وغیرہ کا رجحان ہو اللہ تعالیٰ انہیں بھی نیک ہدایت دے اور یہ آنے والا رمضان ہم سب کے لیے خیر و برکت کا وسیلہ ہو آمین۔

سیّد ارتقاء احمد زیدی "اطراف" کے قلمی سرپرست بھی ہیں اور خیر خواہ بھی وزارت تجارت کے جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے پھلوں، سبزیوں پر تحقیق کی اور غذائیت میں افادیت کے نام سے اطراف میں یہ سلسلہ کئی ماہ چلا۔ پھر یہ کتابی شکل میں شائع بھی ہوا۔ اپنی ملازمت کے دوران کے اہم واقعات پر بھی انھوں نے سلسلہ اور مضامین سے نوازا اب ہماری درخواست پر امریکہ میں گزاری گئی عیدوں پر ایک تحریر عنایت کی ہے

میمفس کی مسجد سلام میں نمازِ عید

تحریر:.................سیّد ارتقاء احمد زیدی

ملک سے باہر رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ عید منانے کا تجربہ بھی منفرد اور دلچسپ ہوتا ہے۔ میرا بیٹا امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہر میمفس میں مقیم ہے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو انسانی حقوق کی مہم چلانے پر ۴ اپریل ۱۹۶۸ کو گولی مار کر

عید کی ساری تقریبات ایک ہی دن میں پوری

ہلاک کر دیا گیا تھا۔ یہ شہر پریسلے Elis Presley کی وجہ سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ جو مشہور سنگر اور اداکار تھا۔ اسی شہر میں دنیا کی سب سے بڑی کارگو کمپنی فیڈکس Fedex کا ہیڈ کوارٹر ہے جس کا اپنا ہوائی اڈہ اور سات سو سے زیادہ کارگو جہاز ہیں۔ میں کئی مرتبہ بیٹے سے ملنے یمفس گیا اور تین مرتبہ عیدالفطر وہاں منائی۔

پہلی عید ۲۰۰۹ء میں وہاں کی۔ اس وقت میفیس میں صرف تین مساجد تھیں جن میں سب سے بڑی مسجد سلام تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بھی چند ہزار تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ مسجد تراویح پڑھنے والوں سے بھری رہتی تھی۔ ہم نے عید کی نماز بھی اسی مسجد میں پڑھی عید کا پورا دن بڑا مصروف گزرا۔ دوپہر کو پاکستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں کے ایک گروپ کی طرف سے دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو ایک دوسرے گروپ کی طرف سے چائے پارٹی اور تیسرے گروپ کی طرف سے دیئے گئے عید ملن ڈنر میں شرکت کی۔ عید کی ساری تقریبات اسی دن ختم ہوجاتی ہیں کیونکہ اگلے دن سب لوگوں نے اپنے اپنے کام پر جانا ہوتا ہے۔ یہاں پاکستانی زیادہ تر ڈاکٹر ہیں۔ یہاں مجھے یہ بات پسند آئی کہ غیر مسلم ڈاکٹر مسلمان ڈاکٹروں سے بھرپور تعاون کرتے ہیں اور ان کی جگہ ہسپتالوں میں ڈیوٹی انجام دیتے ہیں مسلمان ڈاکٹر بھی غیر مسلمان ڈاکٹروں کے مذہبی تقریبات پر ان کی جگہ کام کرتے ہیں۔ پچھلے سال (2024) میں مجھے ایک دفعہ پھر میمفس میں عیدالفطر منانے کا موقع ملا۔ یہ جان کر بہت خوشگوار حیرت ہوئی کہ عید کی نماز کا عظیم الشان اجتماع زرعی سینٹر کے بہت بڑے ہال میں ہوا جہاں 5 ہزار سے زیادہ افراد نے نماز ادا کی جس میں خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ مزید حیرت اس وقت ہوئی جب مجھے بتایا گیا کہ اس ہال میں ہمیشہ دو مرتبہ عید کی نماز ہوتی ہے کیونکہ ایک مرتبہ ہی تمام نمازی یہاں نہیں سما سکتے۔ دوسری دفعہ کے باوجود بھی کچھ افراد نماز پڑھنے سے رہ جاتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق میمفس میں مسلمانوں کی تعداد 20 ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ جن میں زیادہ تر پاکستانی اور بھارتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق مشرق وسطی اور امریکہ سے ہے۔

عید کی نماز کے بعد ڈاکٹروں کے مختلف گروپوں نے اپنے گھروں پر دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر گھر پہنچے تو بیٹے نے بتایا کہ رات کو عید ملن ڈنر اسلامک سینٹر کے کمیونٹی ہال میں ہے جس کے لیے اس نے ہمارے ٹکٹ بھی خریدے ہوئے ہیں۔ ممفس

غیر مسلم ڈاکٹر۔ مسلمان ڈاکٹروں سے بھرپور تعاون کرتے ہیں

میں اچھی بات یہ ہے کہ جتنی بھی تقریبات ہوتی ہیں ان کا بوجھ کسی ایک فرد یا کسی ایک گروپ پر نہیں ڈالا جاتا کھانے کے انتظام کا ٹھیکہ کسی ریسٹورنٹ کو دے دیا جاتا ہے اور ڈنر کی لاگت کے حساب

امریکہ میں عیدیں

سے ٹکٹ فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ جو پہلے آیئے اور پہلے پایئے کی بنیاد پر جلد ہی فروخت ہو جاتے ہیں۔ اس لیئے کئی افراد ڈنر میں شرکت سے محروم رہ جاتے ہیں اور اپنے گھر میں ہی ڈنر پر لوگوں کو مدعو کر لیتے ہیں۔

2008 میں قائم ہونے والا

میمفس اسلامک سینٹر امریکہ میں سب سے بڑا

اسلامک سینٹر کی بنیاد 2008 میں رکھی گئی تھی جسے اب ماشااللہ امریکہ میں سب سے بڑا اسلامک سینٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

یہ 18 ایکڑ پر محیط ہے۔ جس میں مسجد کمیونٹی ہال۔ ڈے کیئر سینٹر۔ انڈور گیمز فٹ بال کرکٹ والی بال کے ایک سے زیادہ گراونڈ ہیں۔ ایم آئی سی (MIC) کا انتظام ایک بورڈ کرتا ہے جس کے ممبروں کی تعداد دس ہے جو دو سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔

وہاڑی سے کوالالمپور تک سحر و افطار کے سلسلے

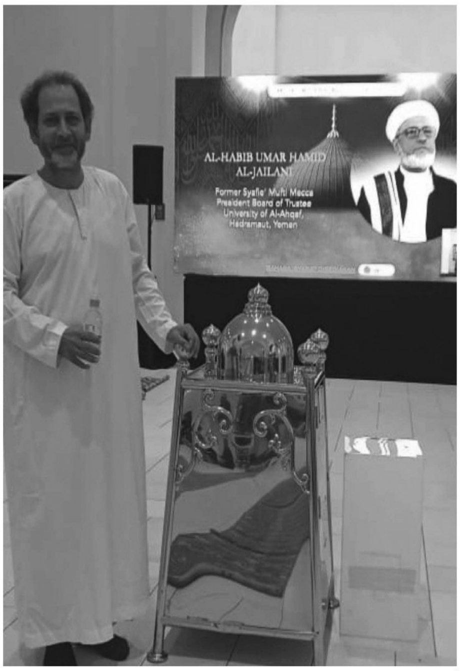

تحریر: حافظ نعمان ساجد (ملائشیا)

مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ میں نے پہلا روزہ کب رکھا خود رکھا یا گھر والوں کی طرف سے رکھوایا گیا تاریخ اس بارے میں خاموش ہے پاکستان میں کبھی بھی میں پورے روزے نہیں رکھ سکا کچھ نہ کچھ چھوٹ جاتے جب میں آبائی گھر میں تھا تو والدین سحری کے لئے اٹھاتے تھے موبائل تو اس وقت نہیں تھا میرے آبائی شہر وہاڑی میں سحری کے وقت ٹین کا خالی کنستر بجانے کا رواج تھا سحری کے وقت امی سب بہن بھائیوں کے لئے کبھی پراٹھے آملیٹ تو کبھی چوری بنا دیا کرتی تھیں غالباً دس یا بارہ سال کی عمر میں میں نے جامعہ مسجد باغوالی سے قرآن مجید حفظ کیا رمضان میں شہر کی مساجد کے علاوہ دیہات کی مساجد میں بھی تراویح میں سامع کی حیثیت سے قرآن مجید سنتا تھا

سامع کی حیثیت سے قرآن کئی بار سنا

سامع کے فرائض میں جب تراویح میں قرآن مجید پڑھنے والا حافظ قرآن کی کوئی آیت بھول جاتا تو سامع پیچھے سے بول کر وہ آیت یاد دلا دیتا اس عمل کو لقمہ دینا کہتے ہیں کچھ عرصہ بعد والد صاحب نے گھر پر ہی میرے لئے تراویح پڑھانے کا انتظام کر دیا جس میں محلے کی خواتین اور بچے بھی میرے پیچھے تراویح پڑھتے تقریباً تین چار سال گھر میں تراویح پڑھانے کا سلسلہ جاری رہا پھر بسلسلہ روزگار لاہور

بارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا

جانا پڑا۔ وہاڑی میں تراویح شبینہ پڑھانے کا بھی رواج تھا۔ افطاری میں گھر پر کرتا تھا۔ پکوڑے فروٹ چاٹ کھجور اور روح افزا کا شربت گھر کی افطاری کے لوازمات تھے جب کبھی امی کالے مسور کی دال

پکاتیں تو مسجد میں جا کر بھی افطاری کرتا۔ رمضان میں حافظ قرآن دراصل ایک ہی بار قرآن مجید ختم کرتا ہے مگر سارا دن قرآن مجید کی دہرائی سے وہ قرآن مجید تین یا چار بار ختم تصور کیا جاتا ہے رمضان میں میرا ابھی یہی معمول ہے ہاں ایک بات یاد آئی کہ ختم قرآن پر

حافظ کو مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے نقد رقم اور کپڑوں کا جوڑا بھی مل جاتا ہے

سامع اور تراویح پڑھانے والے حافظ کو مسجد انتظامیہ یا نمازیوں کی طرف سے کچھ نقد رقم اور کپڑوں کا کبھی سلا جوڑا یا ان سلا کپڑا مل جاتا ہے اس طرح مجھ سمیت دیگر حفاظ کی عید کے کپڑوں کی خریداری کا خرچ بچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود گھر والے میرے لئے عید پر کپڑوں کا نیا جوڑا اسلواتے شادی کے بعد میں اپنی اہلیہ ڈاکٹر سعدیہ سلطان کی طرف سے ان کے کہنے پر الگ سے قرآن مجید ختم کرتا ہوں دراصل ہمارے گھر میں شروع سے ہی روزہ کشائی سال گرہ شادی بیاہ پر ڈھولکی بجانے اور گیت گانے کا رواج نہیں تھا ابا جان آغا طالش کی طرح قدرے سخت گیر تھے اور وہ ان رسومات کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ یہ روایات رسومات گھر کے علاوہ میری زندگی میں بھی نہیں پنپ سکیں خود میرے بچے اور اہلیہ بھی نمود و نمائش سے کوسوں دور ہیں اور سوشل میڈیا پر تصاویر ڈالنے کے سخت خلاف ہیں کیونکہ وہ نظر بد کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں اور مجھے بھی سختی سے منع کیا ہے کہ ان کی تصاویر سوشل میڈیا پر نہ ڈالوں۔ زکوٰۃ میری اہلیہ ادا کرتی ہیں اور وہ یہاں پر بھی اور پاکستان بھی زکوٰۃ بھجواتی ہیں رمضان میں ٹی وی چینلز نہیں دیکھتا زیادہ تر عبادت اور نیند میں وقت گذر جاتا ہے۔ جب عید کارڈوں کا سنہرا دور تھا اس وقت دوستوں عزیز و اقارب کو تواتر سے عید کارڈ بھیجتا تھا اب تو وہ دور بھی ختم ہو گیا عید پر بہن بھائیوں کو فون پر مبارک باد دے دیتا ہوں۔ وہاڑی میں قدیمی عید گاہ میں والد صاحب بھائیوں اور بھتیجوں کے ہمراہ نماز عید ادا کرتا تھا اب یہاں قریبی جامع مسجد تنکو امپوآن جماع میں نماز عید ادا کرتا ہوں اہلیہ کے پرزور اصرار پر ان کی طرف سے تیار کردہ عید کے نئے کپڑے زیب تن کر لیتا ہوں ورنہ کپڑوں اور جوتوں کے معاملہ میں بہت سادگی پسند ہوں۔ ۞

رمضان چینلز پر طوفانِ بدتمیزی

عالیہ زاہد بھٹی کی ضمیر بیدار کرتی تحریر

مولانا یونس پالن پوری ایک واقعہ سناتے ہیں کہ جب میں عمرہ کرنے گیا تو آصف شیخ مجھے ساتھ لے کر ایک ڈاکٹر علوی صاحب کو مبارکباد دینے گئے کہ انہیں بادشاہ نے شہریت دی تھی۔وہ ڈاکٹر بھی کیا کمال کے تھے۔ان کے ساتھ جدہ کا سفر کیا۔

انہوں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک عجیب وغریب سوال کردیا:

مکہ کے پہاڑ اتنے بنجر کیوں ہیں۔۔۔؟

شاہ صاحب میں نے دنیا کے کئی پہاڑ دیکھے مگر وہ مکہ کے پہاڑوں کی طرح بنجر اور بے آب وگیاہ نہیں ہیں۔۔۔؟

اس کے پیچھے اللہ کی منشا کیا ہے۔۔۔؟

اپنا علم تو وہیں دھرارہ گیا۔میں نے تو سرنڈر کردیا۔

وہ مسکرائے اور کہنے لگے:

قبلہ اللہ پاک چاہتے تھے کہ آنے والے حاجیوں کی توجہ صرف میرے گھر پر رہے۔ اس شہر کو پکنک پوائنٹ نہیں بنایا جائے۔۔ بات دل کو لگی۔

یہ پرانا واقعہ مجھے اب کیوں یاد آیا۔۔۔؟

یہ جو رمضان شریف میں چینلز پر طوفان بدتمیزی چل رہا ہے یہ

مکّہ کے پہاڑ اتنے بنجر کیوں ہیں

باقاعدہ سوچی سمجھی سازش کے ساتھ مختلف میڈیا مالکوں کو کروڑوں روپے دیئے جارہے ہیں کہ رمضان کا تقدس پامال کرو،سحروافطار کے اوقات کو تفریح بنادو۔

رمضان کوئی فیسٹیول نہیں ہے۔وہ اوقات جو اللہ کی رحمتیں لوٹنے کے ہیں،سب ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔

وہ گھڑیاں جو دعائیں مانگنے کی ہوتی ہیں ہم کیا دیکھ رہے ہوتے ہیں۔۔۔؟

سراسر لہو ولعب،کھیل تماشہ اور رنگ بازی، نام اس کا رمضان اسپیشل ہوتا ہے۔

اللہ پاک ہم پر رحم کرے۔

ایک ویڈیو دیکھی.دوسنگرز کچھ گا رہی ہیں۔حاضرین تالیاں پیٹ رہے ہیں۔کہیں انعامات کی بارش ہورہی ہے اور کہیں موبائل بانٹے جارہے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ دین فروش مولوی بھی

رمضان کوئی فیسٹول نہیں ہے

ہائر کرلئے جاتے ہیں تاکہ اس پروگرام کو اسلامی کہا جاسکے۔

جہالت کے پاس حق سے زیادہ دلیلیں ہوتی ہیں۔یہ تو ہمیں شوگر کوٹڈ زہر کی گولیاں دی جارہی ہیں۔ہماری عبادات کے تقدس کو برباد کرنے کا پروگرام ہے کہ ہماری مذہبی روایات واقدار کی روح ماردی جائے۔یہ شیطان ہی ہے جوحیلوں اور بہانوں سے ہماری خواہشات پر ڈھلے ہوئے کاموں کو دین بنادیتا ہے۔وہ گناہ کے کاموں کو نہایت دلفریب اور خوب صورت بنادیتا ہے مثلاً اچھے اچھے شاعر اپنے تئیں کئی گانوں کو مشرف بہ نعت کرتے رہے کہ گانوں کی دھنوں پر نعتیں کہتے رہے۔

اللہ معاف کرے،نعت سن کر دھیان فلم کے سین پر چلا جاتا ہے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ٹی وی کی لغویات سنتے ہوئے روزہ اچھی طرح گزر جاتا ہے حالانکہ روزہ انہی شیطانی کاموں سے بچنے کا نام ہے وگرنہ اللہ کو ہمارے بھوکا رکھنے سے کیا

فلمی گانے مشرف بہ نعت کیے گئے

مطلب.

روزہ اللہ کے لئے ہے اور اس کا بدلہ بھی اللہ کے پاس ہے بلکہ وہ خود اس کا اجر دے گا۔روزہ سحری سے افطار تک عبادت ہی تو ہے بلکہ اس کا اہتمام بھی عبادت ہے۔

یہ مہینہ اللہ کے لئے سرنڈر کرنے اور خودسپردگی کا نام ہے۔سحری سے پہلے تلاوت کی جائے،افطار کے بعد تراویح کی فکر کی جائے نہ کہ کھیل تماشہ دیکھے جائیں۔

روزہ محسوس کرنے کا نام ہے اوراس کی نعمتوں کا شکرادا کرنے کا نام۔

مجھے تو اب جاکے احساس ہوا کہ اللہ نے مکہ کے پہاڑ اس قدر بنجر کیوں رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ ہماری توجہ چاہتا ہے وگرنہ وہ بہت بے نیاز ہے اتنا بے نیاز ہے کہ بندہ سراسر زنگ ہوجاتا ہے،دل سیاہ ہوجاتا ہے اور عقل کے در بند ہوجاتے ہیں۔اس کی توجہ ہی تو روشنی ہے۔سب کچھ انسان پر عیاں کردیتی ہے۔شرط وہی ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے،طلب پیدا کی جائے اور دامن وا کیا جائے۔

جس طرح کے میلے ٹھیلے ٹی وی پر ہورہے ہیں اللہ تو انسان کو ویسے ہی بھول جاتا ہے۔وہاں تو اپنی خواہشات کو جوس پلایا جارہا ہوتا ہے۔

سب رنگینیوں میں گم ہیں.روزہ داروں کو چاہیے کہ وہ اپنے اس عظیم عمل کی حفاظت کریں۔

رسول پاک ﷺ نے جبرائیلؑ کی ایک دعا پر کہ جس کو رمضان شریف ملے وہ اپنی بخشش نہ کرواسکے،اس کی ہلاکت ہو،آمین کہی تھی۔۔۔

برکتوں والے اس مہینے کو قیمتی بنائیں اور اللہ کی ناراضگی کا باعث نہ بنیں۔❁

امریکہ میں رمضان اور عید

عاصم متین خان کتابوں کے عشاق میں سے ہیں۔ نیویارک میں مقیم اطراف کے خصوصی نمائدے ہماری درخواست پرانتہائی معیاری تحریریں ارسال کرتے ہیں۔اس بار امریکہ میں مقیم پاکستانی رمضان اور عید کی تیاریاں کیسے کرتے ہیں؟کی تفصیلات بہت ہی دل نواز انداز یمں بتا رہے ہیں۔پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کریں

تراویح کے بعد مسجد انتظامیہ کی طرف سے نمازیوں کیلئے چائے

عاصم متین خان

امریکہ میں ’اطراف‘ کے نمائندہ خصوصی

رمضان المبارک کی برکتیں اور رونقیں دنیا بھر کی طرح امریکہ کے طول وعرض میں بھی مذھبی جوش وخروش کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ رمضان کا چاند نظر آتے ہی مسجدیں تراویح کے لئے آنے والوں سے بھر جاتی ہیں۔ بچے بوڑھے جوان اور خواتین مسجدوں میں رمضان المبارک کی رحمتوں سے فیضیاب ہونے آجاتے ہیں۔ تراویح کے بعد امام مسجد نے جو پارہ پڑھایا ہوتا ہے وہ اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو صبح سویرے کام پر نہیں جانا ہوتا وہ دیر تک مساجد میں قیام کرتے ہیں مساجد کی انتظامیہ مسجد میں تراویح کے بعد چائے پانی کے ساتھ مصلیوں کی تواضع کرتی ہے۔ سحری کے بعد بھی لوگوں کی اکثریت نماز فجر کے لیے مسجد آتی ہے۔ فجر کی نماز کے بعد متعدد لوگ مسجد میں ہی قران شریف کی تلاوت کرتے ہیں اس کے بعد اپنے کام پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ تمام مساجد کی انتظامیہ اپنی اپنی مساجد میں افطار کا بھی انتظام کرتی ہے عام طور پر علاقے کے لوگ ہی اپنی مساجد میں لوگوں کے لیے افطار کا انتظام کراتے ہیں اور ہر روز تقریبا ایک یا دو افراد کی طرف سے افطار کا خرچہ ادا کیا جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں مسافر بھی قریبی مساجد میں افطار کے لیے رک جاتے ہیں اور پھر مغرب کی نماز پڑھ کے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ کمیونٹی کے بعض لوگ اور فیملیز افطار کے لیے ایک ہی جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اکثر ون ڈش افطار پارٹیز ہوتی ہیں تا کہ کام کرنے والوں پر روزے میں زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ اور پھر عشاء کے وقت سے دوبارہ مسجد میں تراویح کی رونقیں لوٹ اتی ہیں۔ نیو یارک سمیت کئی دیگر ریاستوں کی مقامی حکومتوں کی جانب سے اذان کو لاؤڈ سپیکر پر نشر کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد میں مصلیوں کے لیے جگہ کم پڑنے کی صورت میں مسجد سے باہر متصل سڑکوں پر بھی نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر رمضان المبارک کے دوران مساجد کی حفاظت کے لیے مقامی پولیس کی گاڑیاں بھی کھڑی رہتی ہیں اور بعض پولیس کی گاڑیاں علاقے میں حفاظتی گشت کرتی رہتی ہیں۔ رمضان شروع ہونے سے قبل مقامی پولیس کمشنر اپنے علاقے کی مساجد کی انتظامیہ سے میٹنگ رکھتے ہیں تا کہ ان کی ضرورت کے پیش نظر مناسب حفاظتی انتظامات یا ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لیئے مناسب اقدامات کئے جا سکیں۔ بعض مساجد نے اپنے طور پر بھی سیکیورٹی گارڈز کو رکھا ہوا ہے جو جمعے اور تراویح کے دوران مسجد کے دروازے پر چوکس کھڑے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اب مقامی حکومتیں اور حتیٰ کہ وائٹ ہاؤس تک میں سرکاری سطح پر افطار کا انتظام کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

رمضان کے آخری عشرے میں علاقے کے لوگ پہلے ہی سے اپنے نام مسجد میں اعتکاف کے لیے لکھوا دیتے ہیں کہ وہ رمضان کے آخری دس ایام میں مسجد میں قیام کریں گے۔ بعض بڑی مساجد میں متعکفین کے لئے جگہ کم پڑ جاتی ہے اور مسجد میں قیام کرنے کے خواہشمند لوگ

ٹائم اسکوئر میں تروایح کی نماز ادا کی جارہی ہے

اوہائیو GE دفتر میں عید ملن

زیادہ ہوتے ہیں اس کے لیے پہلے آنے والوں کو پہلے جگہ دی جاتی ہے اور جگہ نہ ملنے تو پھر بعد میں آنے والوں سے معذرت کی جاتی ہے۔ علاقے کے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اعتکاف کرنے والوں کے لیے سحری کا انتظام کریں اس کے لیے بھی وہ مسجد کی انتظامیہ کے پاس اپنے نام لکھوا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد میں آخری دس ایام میں شبینے کی محفلیں بھی ہوتی ہیں اور اکثر یہ شبینے کی محافل تراویح کی نماز کے بعد خصوصی طور پر منعقد کی جاتی ہیں۔ اس

عید کے لیئے کپڑے اور جوتے پاکستان سے منگوائے جاتے ہیں

میں بھی علاقے کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رمضان المبارک کے مہینے میں عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بھی جاتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ آخری 10 ایام خانہ کعبہ میں یا مسجد نبوی میں گزاریں۔

امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت رمضان المبارک میں زکوۃ اور صدقات کا بھی خاص خیال رکھتی ہے اور اکثر اوقات وہ یہ زکوۃ صدقہ اور خیرات پاکستان میں اپنے رشتہ داروں کو بھجوا دیتے ہیں تا کہ وہاں پر ضرورت مندوں میں اس کو تقسیم کیا جا سکے۔ اکثر مساجد 27 رمضان المبارک کو ختم القران کا انعقاد کرتی ہیں اس رات مسجدوں میں رش زیادہ ہوتا ہے جس کے پیش نظر مسجد کی انتظامیہ خصوصی انتظامات کرتی ہے اور امام صاحبان ختم القرآن کے بعد رو رو کر خصوصی دعائیں کرتے ہیں۔

رمضان کے شروع ہوتے ہی لوگ عید کی تیاری بھی شروع کر دیتے ہیں۔ خاص طور پر اپنے بچوں کے لیے اور اپنے لیے عید کے کپڑوں کی خریداری پر بڑا زور ہوتا ہے۔ کچھ لوگ رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی پاکستان سے اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے عید کے کپڑے جوتے منگوا لیتے ہیں۔ وہ پاکستان میں موجود اپنے رشتہ داروں سے یہ کام کراتے ہیں جوان کے کپڑے تیار کرا کر اور جوتے خرید کر یا تو کسی آنے والے کے ہاتھوں امریکہ بھیج دیتے ہیں یا پھر ڈاک یا DHL کے ذریعے یہ کام کیا جاتا ہے۔ اب تو امریکہ کے تمام بڑے شہروں میں پاکستان کے بڑے ڈیزائنرز کے ملبوسات با آسانی دستیاب ہیں۔ نہ صرف ان کی یہاں پر دکانیں بھی ہیں بلکہ وہ آن لائن بھی شاپنگ کرنے والوں کو کپڑے جوتے بھجواتے ہیں۔ اس کے علاوہ علاقے کی مساجد میں اور کسی بڑے ہال میں عید بازار کے انتظامات بھی کئے جاتے ہیں جس میں مقامی اور پاکستان سے آنے والے ڈیزائنر کے کپڑے اور جوتوں کے سٹال بھی لگائے جاتے ہیں۔ ان عید بازاروں میں بھی بڑا رش ہوتا ہے۔ ان عید بازاروں میں کپڑے جوتے اور چوڑیوں کے علاوہ کھانے پینے کے سٹال بھی لگائے جاتے ہیں اور مہندی لگانے کا بھی خاص انتظام کیا جاتا ہے۔ چاند رات کے لئے خاص پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں اس میں پاکستان سے آئے ہوئے فنکار بھی بعض اوقات شرکت کرتے ہیں۔ رات دیر تک یہ چاند رات کی محفل جمی رہتی ہیں اس کے بعد لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ اکثر خواتین عید سے چند روز قبل ہی عید کے لیے لوازمات کی تیاری شروع کر دیتی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کھانے کی تیاری کرنے کے بعد وہ چاند رات کو زیادہ اچھے طریقے سے منا سکتی ہیں۔ لیکن بعض کام کرنے والی خواتین چاند رات کو ہی کھانے پینے کے انتظامات کرتی ہیں۔ اکثر مسلمان رمضان اور عید کے لیے چھٹیاں لے لیتے ہیں

اعتکاف کیلئے پہلے سے اپنے نام مسجد میں لکھوا دیئے جاتے ہیں۔

کچھ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان چلے جاتے ہیں۔

تمام مساجد میں عید کے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت عید کے لیے پہلے سے ہی اپنی چھٹی کا نظام کر کے رکھتی ہے متعدد بڑی ریاستوں میں عید کے دن سرکاری چھٹی ہوتی ہے اور جن اسکول ڈسٹرکٹ میں چھٹی نہیں ہوتی تو وہاں پر بھی عید کے دن کوئی نیا سبق پڑھایا نہیں جاتا۔ عید کی نماز کے بعد بھی مساجد میں نماز کے لیے آنے والوں کے لیے شیر اور چاٹ اور سموسوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ جن کے پیارے اپنے خالق سے جا ملے ہیں وہ عید کی نماز کے بعد قبرستان جا کر اپنے پیاروں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے رشتے داروں میں اور دوستوں میں جا کر عید ملتے ہیں۔ اکثر فیملیاں ایک ہی جگہ پر جمع ہو کر عید مناتی ہیں۔ آج امریکہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے بسنے کے باعث رمضان المبارک کی رونقیں اور عید کی خوشیاں بڑی حد تک وطن عزیز میں منائی جانے والی عید اور رمضان کی رونقوں کی کمی کو بڑی حد تک کم کر دیتی ہے!

نمازِ عید میں راقم کی فیملی

"پشاور میں ناصر علی سیّد اطراف کے قلمی سرپرست ہیں۔ان سے درخواست کی تھی کہ کسی فعال قلم کار کو اطراف میں پشاور پر لکھنے کیلئے آمادہ کریں۔جناب عمر حیات نے یہ ذمہ داری بخوشی قبول کر لی ہے۔اور بہت ہی شگفتہ اور معلوماتی تحریر سے نوازا ہے۔پڑھیے اور اپنی رائے سے نوازیئے"

رمضان سے جڑے پکوان، جن کے بغیر سحر و افطار ادھوری

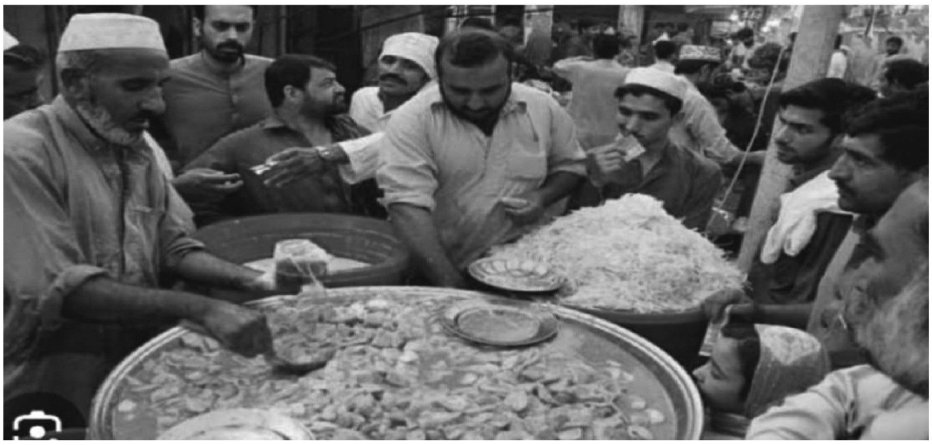

پشاور سے سینئر صحافی عمر حیات کی تحریر

رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہوتے ہی دو چیزوں پہ دھیان رہتا ہے عبادت اور کھانے کے لوازمات۔

رمضان ہو اور دسترخوان نہ سجیں ایسا کیسے ممکن ہے دنیا میں جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں، وہاں رمضان کا نام آتے ہی بعض مخصوص علاقائی پکوانوں کے تصور سے منہ میں پانی بھر آتا ہے

پشاور میں بھی رمضان سے کچھ ایسے ہی پکوان جڑے ہیں جن کے بغیر سحر و افطار ادھوری سی رہتی ہے۔

اس مبارک مہینے میں ہر خاتون خانہ کی ذمہ داریاں کچھ زیادہ ہو جاتی ہیں اور خاص طور پر اگر آپ اور آپ کی فیملی کھانے پینے کے شوقین بھی ہوں

اور اپنے چاہنے والوں کی فرمائشیں مزے مزے کے چٹ پٹے کھانوں سے پوری کریں۔

ان لوازمات میں جو ایک چیز مشترکہ طور پر غریب و امیر کے دسترخوان پہ لازم ہو جاتی ہے۔

دسترخوان طرح طرح کے پکوانوں سے سجنے لگتے ہیں اور ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق افطاری کا اہتمام کرتا ہے۔مگر افطار کے وقت پکوڑے نہ ہوں یہ تو ناممکن ہے۔ہمارے ہاں خواتین افطار کے وقت کچھ اور بنائیں یا نہ بنائیں پکوڑے ضرور بناتی ہیں۔ بلکہ اب تو دوسرے ممالک میں بھی مسلمان افطار کے وقت پکوڑوں کا اہتمام کرتے ہیں پاکستان میں خیبر پختونخوا کے باسی بھی پکوڑوں کے شیدا ہیں پشاور کے کریم پورہ کے پکوڑے یا خاص چڑی پکوڑہ ہو، سوات کے اوجڑی کے پکوڑے۔بس خیبر پختونخوا کے مسلمانوں کے لئے روزے اور پکوڑے لازم و ملزوم ہیں ان کے بنا شاید روزہ کھولنا مکروہ سمجھا جاتا ہے۔

عام دنوں کے لحاظ سے رمضان المبارک میں گوشت قیمہ اور مرغی کے مختلف پکوان زیادہ پکائے جاتے ہیں پشاور شہر کے رہائشیوں کو سری پائے جس کو اپنی زبان میں پانچے کہتے ہیں بہت پسند ہیں آج کل گیس اور بجلی کی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے پانچے بازار سے منگوانے پڑتے ہیں اور سب سے زیادہ رش پانچا فروشوں پر ہوتا ہے پانچا فروشوں میں نیکا، نعیم جان ریتی والے رمیش بیرون گنج گیٹ کوہاٹ روڈ قبرستان والے صدیق ہشت نگری والے بشیر کٹھے والے شیرا محلہ

چڑی پکوڑے، سوات کے اوجڑی کے پکوڑے

کشمیری والے ان مشہور دکانوں پر بہت رش پائی جاتی ہے چٹ پٹے لوازمات پہلے خواتین گھر پہ ہی بناتی تھیں مگر اب مصروفیت کی وجہ سے بھیا کے دہی بھلے خڑو کا کچالو پیڑا اقبال شاہ پھندو روڈ والے کے

پشاور میں رمضان

سپیشل چٹنی والے کچالو پہلوان کے چھولے قصہ خوانی کی ٹماٹر کی چٹنی ہو یا کھیر پشاور شہر کی سوغات لال مربہ زیادہ فروخت ہونے والی چیزوں میں سے ہے۔اسی طرح گلبہار میں وسیع اللہ کے سیخ کباب سٹار بیکری کے کریم رول کریم پورہ میں تیار ہونے والی رول پٹی سموسہ پٹی کی بھی اچھی خاصی خرید وفروخت ہوتی ہے زیادہ تر خواتین شامی کباب چنہ چاٹ میکرونی آلو پکوڑے اور مزید کھانے کی چیزیں گھر میں تیار کرنا پسند کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک میں گھروں میں خواتین زیادہ مصروف رہتی ہیں مرد حضرات بازار سے بھی لوازمات خریدنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

چٹ پٹے لوازمات مشہور بھی ہیں اور دستیاب بھی

گھنٹہ گھر کی پنیر مون لائٹ بیکری یا کہ دتہ حلوائی کے سموسے۔سلمان بیکری کے پیٹس کی بھی بڑی مقدار میں خریداری کی جاتی ہے۔
سبزی منڈی فردوس کی ہو یا گھنٹہ گھر کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی سبزی آلو ہوگی اور اگر فروٹ کی بات کرے تو سیب کیلا امرود فروٹ چاٹ بنانے کی وجہ سے زیادہ فروخت ہونے والے فروٹ میں شامل ہے پھر پشاور میں نصف رمضان کے بعد رات عید کی شاپنگ کے ساتھ ساتھ حافظ جی کی چانپیں اور چکن روسٹ شیخ قصہ خوانی بازار والے کا دیگی چکن اور خاص طور پر اشرف روڈ اور دلہ زاک روڈ پر سیخ تکہ کی دکانوں پر کھڑکی توڑ رش پایا جاتا ہے اللہ تعالی ہمارے ملک اور شہر پشاور کی رونقیں آباد رکھے اور یہ سلسلے یونہی چلتے رہیں۔

گجرات میں رمضان اورعید

"نازیہ آصف کی اُردو بہت شستہ اور بامحاورہ ہے۔اطراف کی درخواست پر وہ سوہنی مہینوال کے شہر گجرات کے روزوں اور عید کا احوال بیان کر رہی ہیں۔صدیوں پرانی روایات کونسی ہیں۔کونسی نہیں، سو سال پرانی دکانوں کی وہی مٹھاس وہی ذائقے۔پڑھیئے اوراپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔"

عید کی تیاریاں شروع رمضان سے ہی

تحریر:...............نازیہ آصف... گجرات

شوال عربی زبان کا لفظ اور اس کا معنی ''اوپر اٹھنا، بلند ہونا" کے ہیں ایک روایت میں اس کا مطلب اونٹنی کا دم اوپر اٹھانا بھی ہے یعنی سفر پہ جانا، خطہ عرب کے لوگ اس مہینے میں سیر و سیاحت کے لیے نکلتے تھے،تو اس حوالے سے بھی اسے شوال کہا جانے لگا۔

ماہ صیام میں دن بھر کے روزے کے بعد نماز تراویح کا اہتمام ہوتا ہے۔ ہر شہر ہر خطے کے اپنے مذہبی و ثقافتی رنگ ہوتے ہیں ۔اسی طرح ہمارے مردم خیز شہر گجرات کے بھی اپنے اندازوں اطوار ہیں۔

ہم سب سے پہلے ماہ صیام میں نماز تراویح کی بات کرتے ہیں۔ ویسے تو ہر محلے کی مسجد میں نماز تراویح کا اہتمام ہوتا ہے مگر تراویح کا سب سے بڑا اجتماع شہر کی عیدگاہ مسجد میں اس کے علاوہ ، محلہ رنگپورہ میں، پیر ولایت شاہ مسجد و مدرسہ، شاہدولہ دریائی صاحب کے مزار سے متصل تاریخی مسجد، مسجد شاہدولہ، مرکز اشاعت وتوحید وسنہ کابلی دروازہ، مرکز فیضان مدینہ ،(زیر انتظام دعوت اسلامی)، باری (کھڑکی) والی مسجد اندرون شہر نزد چوک ماہنہ، جامع مسجد گلزار مدینہ میں منعقد ہوتے ہیں۔

کافی طویل عرصہ پہلے ان مساجد میں محافل شبینہ بھی منعقد کی جاتی تھیں ۔جن میں معزز معتبر حفاظ اکرام رات بھر جاگ کر قرآن پاک کی قرأت فرماتے ،اور سامعین خاموشی سے پوری رات سکون سے بیٹھ کر سنتے اور ثواب کماتے ،مگر اب نماز تراویح تو ساری مساجد میں خضوع وخشوع سے ادا کی جا رہی ہے لیکن محافل شبینہ اب خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

بحیثیت مسلمان ہم ماہ صیام کی برکتیں سمیٹنے کے بعد یکم شوال کو یوم رحمت مناتے ہیں جیسے عید الفطر یا میٹھی عید بھی کہا جاتا ہے۔

مہینہ بھر کی لگاتار نمازیں، نفلی عبادت، روزے اور پھر سحری وافطاری کی مشقتیں بخیر وعافیت منزل پہ پہنچتی ہیں تو انسان خوش ہوتا ہے اور باری تعالیٰ انسانوں کو یوم سعید عطا فرماتے ہیں۔

اس یوم عید کو پورے ذوق وشوق سے منانے کی تیاریوں کا آغاز ویسے تو شروع رمضان کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے مگر آخری عشرے میں یہ عروج پہ پہنچ جاتا ہے۔متوسط طبقے کی خواتین تو سال بھر سے کچھ پس انداز کرتی رہتی ہیں تاکہ اس تہوار پہ اپنے ارمان دل کھول کر پورے کر سکیں۔بچوں والی سگھڑ خواتین بازار سے کھلا کپڑا خرید کر ماہ صیام کی عبادات اور سحری وافطاری کے ساتھ ساتھ کپڑوں کے نئے نئے ڈیزائن بھی تیار کرنے کی جستجو میں لگی رہتی ہیں۔

اگرچہ اب جدید طرز زندگی میں کافی حد تک آسانیاں آ گئی ہیں جن میں آن لائن شاپنگ نے بہت اہم رول ادا کیا ہے جو ویسے خریداری کے مقابلے میں کافی سستی بھی پڑتی ہے اور اگر خواتین دیکھ بھال کر معروف برانڈز کی ویب سائٹس سے کچھ خریدیں تو ان برانڈز کی مصنوعات مالز کی نسبت کافی سستی ہوتی ہیں۔

نفیس خواتین جوتوں پہ بھی بھرپور توجہ دیتی ہیں میرے سمیت کئی خواتین ہیں جو پہلے جوتا خریدتی اور پھر اس کے ساتھ سوٹ میچ کرتی ہیں جن کی خریداری عموماً آخری عشرے سے شروع ہو کر چاندرات ہی ہی اختتام کو پہنچتی ہے۔

دیکھا ہلالِ عید تو آیا تیرا خیال
وہ آسماں کا چاند ہے تو میرا چاند ہے

ہلال عید دیکھنا کبھی ہماری روایات کا حصہ ہوتا تھا۔سب سے پہلے چاند دیکھنا ہر دل کی امنگ ہوتی تھی۔ادھر افطاری کا وقت ہو رہا ہے، ادھر سب نوجوان دل چھتوں پہ کھڑے ہیں، دل افطاری میں نوبت (ہمارے ہاں ایک ڈھول ٹائپ چیز مسجد میں رکھی ہوتی تھی جو بوقت سحر وافطار ڈم ڈم بجائی جاتی) کی آواز پہ اور آنکھیں ہلال عید کی متلاشی ہوتی تھیں۔جوان دل چاند دیکھنے کے بہانے چھت پہ اپنے پیارے چہروں کو تلاشتے۔گزرے وقت کے ساتھ پھر یہ ذمہ داری ٹیلی ویژن نے لے لی تو گھر کے بڑے جمگھٹے چھت کی بجائے اس کی سکرین کے سامنے ہونے لگے،مگر پھر وقت نے انگڑائی لی تو یہ جمگھٹے مزید سمٹ کر ایک موبائل سکرین پر آ چکے ہیں اب وہ چھتوں پہ شور و غوغے ہوتے ہیں نہ ٹی وی سکرینوں کے سامنے سے شور اٹھتا ہے، بس موبائل سکرین پہ چاند نظر آ گیا تو سب کو چاندرات مبارک کا میسج کر کے کام نبٹا دیا جاتا ہے

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

چاندرات ہو،عید کا تہوار ہو، صنف نازک بھی ہوں اور سولہ سنگھار کا شوق نہ ہو، یہ ممکن نہیں۔کپڑوں جوتوں کے ساتھ سولہ سنگھار جواب بڑھ کر قدرے سولہ سو کے لگ بھگ ہو چکے ہیں ان کی خریداری بھی باقاعدہ مہم جوئی کی رسم ہوتی ہے۔

موتی بازار" پاکستان چوک یا شہر کا تاریخی اہمیت رکھنے والا" شیشیانوالہ دروازہ" سے شروع ہوتا ہے جس میں کئی گلیاں اور موڑ ہیں ،بہت قدیمی بازار ہے جو عید کے دنوں میں بذات خود عید کی طرح سجا ہوتا ہے خواتین کے ریڈی میڈ کپڑے، سولہ سنگھار ، مہندی، چوڑیاں، ابٹن عرق وخوشبوئیات الغرض ہر چیز اس بازار میں دستیاب ہوتی ہے۔

شہر کے وسط میں واقع مسلم بازار، کٹڑہ بازار، موتی بازار ڈھکی بازار ،اور شہر کے مغربی حصے میں مدینہ بازار اس ہلے گلے کے مرکز ہوتے ہیں اس کے علاوہ سیشن کورٹ روڈ اور تاریخی قدیمی شہر بھمبر کو نکلتی بھمبر روڈ پہ قطار در قطار برینڈز بھی گہما گہمی کا مرکز ہوتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی سوچ اور جیب کی استطاعت کے مطابق خریداری کرتا ہے ننھی منی پیاری سی بچیاں اسی بازار میں ماؤں کے پلو پکڑتی اور اور للچاتی نظروں سے، فینسی پنوں، پونیوں اور خوبصورت فراک سے سجی گڑیا میں خود کو دیکھ کر سجتی ہیں جس سے عید کے رنگ دوبالا ہو

جاتے ہیں۔

شہر کے وسط میں، ایک طرف رام پیاری کا پرشکوہ اور دیدہ زیب محل تو دوسری طرف محبت کے استعارے سوہنی (سوہنی مہیوال) کا مٹی کے برتنوں کا بازار، درمیان میں موتی بازار کا ایک گوشہ دوپٹے رنگنے والوں کے لیے بھی مخصوص ہے۔ عید کے دنوں میں قوس قزح سے رنگین دوپٹوں کو سکھانے کی جلدی میں ہوا میں لہرایا جاتا ہے تو آسماں پہ بکھری کسی دھنک کا سا گماں ہوتا ہے۔ بہار و برسات کے رنگ لیے یہ دوپٹے ایک پرامن معاشرے، زندہ دل قوم اور ترقی کرتے دیس کی جوت جگاتے ہیں۔

چاند رات کو مہندی کی خوشبو یا چوڑیوں کی کھنک نہ ہو تو چاند رات ادھوری رہتی ہے۔ یہ اعزاز اور خاصیت موتی بازار کے علاوہ ڈھکی بازار اور کھاری کھوئی بازار کو بھی حاصل ہے کہ مہندی لگانی ہو یا چوڑیاں ہاتھوں پہ پہنانی ہوں یا پیک کرنی ہوں انھیں بازاروں کا رخ ہی کرنا پڑے گا۔ شہر کے مغربی حصے کے لیے یہ خدمات مدینہ بازار سرانجام دیتا ہے۔

جب اتنی ساری مصروفیات ہوں اتنی ساری سج دھج ہو تو یہ کیسے ممکن

سوسالہ پرانی پاک سویٹ۔۔ساٹھ سالہ قدیم قندفشاں

ہے کہ بناؤ سنگھار کر کے گھر میں ہی بیٹھا جائے تو اگلا سلسلہ شروع ہوتا ہے چاند رات کی مبارکباد کا، جس کے لیے شہر بھر میں موجود مٹھائی کی دکانیں اور بیکریاں رات بھر جاگ کر اپنی خدمات پیش کرتی ہیں ان میں چند ایک بہت قدیمی مٹھائی کی دکانیں ہیں جن میں مچھلی چوک میں موجود سوسالہ پرانی پاک سویٹ، مٹھائی محل کابلی دروازہ، محمدی سویٹس سٹاف گلہ، ساٹھ سالہ قدیم قندفشاں ہیں جن کی مٹھائیوں کے علاوہ حلویات بھی بہت مشہور ہیں جو شہری بیرون ملک بھی لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شوکت سویٹ صدی بھر سے دوستوں رشتہ داروں کی محفلوں میں مٹھاس بانٹنے کے بعد اب ختم ہو رہی ہے۔

جبکہ موجودہ دور میں جلال پور روڈ پہ آرایم بیکرز، اجوا بیکریز، گورمے، ہائی کلاس، کیکس اینڈ بیکس، قندفشاں، ذائقہ، ریزسٹ کاکا اور النور سویٹس گاہکوں کی مرکز نگاہ ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی موٹی بیکریز عوام میں شیرینی بانٹ رہی ہیں۔

یوم عید پہ نماز فجر کے بعد نماز عید پڑھنا اس دن کا اہم ترین فریضہ ہوتا ہے جو محلے کی جامع مسجد میں یا پھر شہر کی عیدگاہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ہمارے شہر گجرات میں نماز عید کا ایک بہت بڑا اجتماع یہاں کی تاریخی "جامع مسجد عیدگاہ" میں ہوتا ہے۔ جامع مسجد عیدگاہ شہر کے وسط میں ایک بہت وسیع و عریض تاریخی مسجد اور عیدگاہ ہیں۔ اس کی تعمیر 1930 میں شروع ہوئی اور انجینئر باؤ جان محمد نے لاہور

جامع مسجد عیدگاہ کو پہلا لاؤڈ اسپیکر وزیر اعظم لیاقت علی خان کا عطیہ

کی تاریخی بادشاہی اور دہلی کے جامع مسجد کی طرز پر تعمیر شروع کی جو پانچ سال کے عرصے میں تکمیل کو پہنچی۔ مغلیہ طرز تعمیر کی یہ مسجد دو بڑے مینار اور تین گنبدوں پر مشتمل ہے۔ مسجد کے چوبی دروازے مغلیہ دور کی یاد دلاتے ہیں۔ مسجد سے ملحقہ وسیع ترین گراؤنڈ ہونے کی بنا پر اسے عیدگاہ مسجد بھی کہا جاتا ہے جہاں نماز عید کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ مسجد کو پہلا لاؤڈ اسپیکر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان نے عطیہ کیا تھا۔ اس مسجد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کو یہ مسجد بھولی نہیں، اس وقت جن لوگوں نے جو بھی عطیہ کیا ان کے ناموں کی تختیاں آج بھی مسجد کے داخلی دروازوں کے دونوں طرف لگی ہیں۔ جیسے کہ بھاگ بھری پانچ سو، غلام فاطمہ تیرہ سو، زینب بی بی ڈیڑھ سو، قارئین یہ اس وقت کے جذبات تھے جنھیں پیسوں میں نہیں تولا جا سکتا لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اپنے وقتوں میں یہ بہت بڑی رقوم تھیں۔

آج یاروں کو مبارک ہو کہ صبح عید ہے
راگ ہے، مے ہے، چمن ہے، دل ربا ہے، دید ہے!
(آبروشاہ مبارک)

بدلتی رتوں کے ساتھ ہمارے طعام بھی بدل رہے ہیں۔

محلہ چابک سواراں کے رہائشی رضی احمد صاحب کا کہنا ہے کہ "اب عید میں وہ مزا نہیں رہا جو ہمارے وقتوں میں تھا۔ ہماری والدہ خود ہاتھ اور مشین سے سویاں بناتیں جنھیں وہ پہلے ابالتیں پھر پلیٹ میں ڈال کر دیسی گھی سے چپڑ دیتیں پھر اوپر شکر یا چینی ڈالتیں، جو ہم سارے بہن بھائی مزے لے لے کر کھاتے، اب تو چیزوں کا سواد ہی کوئی نہیں۔ ایک ایک آنہ عیدی ملتی اور اگر وہ آنہ گم ہو جاتا تو سارا دن اسے ڈھونڈنے میں ہی عید بیت جاتی۔

زہرہ بی بی اپنی عیدوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ تب دکھاوا نہیں تھا۔ رشتہ دار مہمان کے ہاتھ یا جیب کی طرف نہیں دیکھتے تھے رشتوں میں خلوص کی چاشنی تھی اکٹھے بیٹھنا معنی رکھتا تھا کھانا پینا مطلوب نہیں ہوتا تھا۔ ایک سوٹ سلواتے عید کے دونوں تینوں دن پہن لیتے تھے۔

چچا کمال دین جو ڈھکی کے پرانے رہائشی ہیں عصر حاضر کے طور طریقوں سے بہت نالاں دکھائی دیے خاص طور پہ اپنی بہو سے، ان کا خیال ہے کہ" آج کی خواتین سارا پیسہ تو اپنے اور بال بچے کے کپڑوں اور لش پش پہ لگا دیتی ہیں، عید کے دن دوسرے کے بچوں کو عیدی دینے کے لیے بھی کچھ پاس نہیں رہنے دیتیں اور پھر ہم سارا دن گھر بیٹھ کر ٹی وی دیکھ کر گزارتے ہیں، کہیں جاتی ہے اور نہ کسی کو اپنے گھر پہ بلاتی ہے۔

شاہی قلعے کے مخصوص حصے میں مقیم آپا بلقیس اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔ ان کا کہنا تھا" قیام پاکستان کے وقت شاہی قلعے کی یہ حویلی ہمیں الاٹ ہوئی، والد صاحب محکمہ تعلیم میں افسر تھے۔ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے تھے اس حویلی میں بہت رونق ہوتی۔ آج جس تخت پہ میں بیٹھی ہوں یہاں میرے والد عید کی نماز پڑھ کر بیٹھتے، اور ہم سب بہن بھائیوں کو عیدی دیتے، ہم سویاں کھاتے، پھر میری سہیلیاں آ جاتیں تو ہم سب قلعے کے بلند ترین برج کی کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر مختصر سے شہر کا نظارہ کرتیں۔ محبت بھرے وہ دن جانے کہاں گئے۔ پھر بھائی کراچی چلے گئے جنھوں نے مڑ کر خبر ہی نہیں لی۔ دو بہنوں کی شادیاں بھی ادھر ہی ہو گئیں، جن میں سے مدت ہوئی کبھی کوئی واپس نہیں آیا، میں تنہا یہاں حویلی میں زندگی کے دن گزار رہی ہوں، یہ کہتے ہوئے بلقیس آپا زار و قطار رونے لگیں۔

محلہ خواجگان کے رہائشی ندیم اختر اپنے بچپنے کو یاد کرتے ہوئے رنجیدہ ہو گئے ان کا کہنا ہے کہ ہم عید پہ اپنی بہنوں کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ہم کبھی اپنے والد اور کبھی والدہ صاحبہ کے ساتھ اپنی بہنوں کو عید سے دو چار دن پہلے عیدی دینے جاتے تھے جو چینی سوجی چاول اور پھوپھیوں کے ساتھ ساتھ ان کے عید کے جوڑے، مہندی چوڑیوں پہ مشتمل ہوتی، اور واپسی میں اماں بہن کی مٹھی میں کچھ نقد عیدی تھمانا کبھی نہ بھولتی تھیں۔ بلکہ کبھی تو اماں ہمیں ساتھ لگا کر سوجی اور میدے کے لڈو تلتیں، جو وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ ہماری پھوپھیوں کے گھر دینا کبھی نہیں بھولتی تھیں، مگر افسوس اب وہ لوگ ہیں نہ وہ ریت رواج۔ نہ ہی اب وہ پکوانوں کی خوشبوئیں کہیں سے اٹھتی ہیں۔ ❁

گوجرانوالہ میں رمضان اور عید

”صدم ساگر گوجرانوالہ سے اطراف کے قلمی معاون ہیں ہماری درخواست پر ہمیشہ اپنے شہر سے گلیوں بازاروں سے موضوع کے حوالے سے دلچسپ معلومات دیتے ہیں۔اس تحریر میں انھوں نے گوجرانوالہ کے مختلف علاقوں میں رمضان اور عید کی تیاریوں کے بارے میں بہت دلچسپ تفصیلات دل کش انداز میں پیش کی ہیں۔“

والدہ دیسی گھی کے گرما گرم پراٹھے بناتیں ہمیں جگاتیں

تحریر: صدام ساگر

دماغ کی بند کھڑکیوں کے تالے کھولتے، سوچ کے کمروں میں پڑی ڈائریوں کے اوراق کھولتے ہی ان گنت یادوں کے پھول مہکنے لگتے ہیں، جن میں بزرگوں کی باتیں، ماں باپ کا ڈسپلن، سرزنش، نصیحتیں اور ان کے زندگی کے تجربات و واقعات۔ جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد تلخ طبیعت کے مالک اور والدہ نرم مزاج کی حامل ہیں۔ ایسے میں ہم جب بھی بچپن میں رمضان کے روزے رکھنے کے

سب کچھ موجود ہے احساس کی خوشبو نہیں ہے

لیے سحری کے وقت اُٹھتے تو ہماری والدہ گرما گرم دیسی گھی کے پراٹھے بنانے پر ہمیں زوردار آواز دیتی کہ ”سب جلدی سے اُٹھ جائیں سحری کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی رہ گئے ہیں“ ہم جلدی سے بستر چھوڑ کر روزہ رکھنے کی تیاری کے لیے بھاگ اُٹھتے۔ جیسے ہی جلدی جلدی سحری کرتے تو والدہ فرماتی کہ ”بیٹا ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے آرام سے کھانا کھاؤ۔“ تقریباً چار سال کی عمر میں ہم ”چڑی“ روزہ رکھا کرتے تھے جو کچھ ہی دیر بعد افطار بھی ہو جاتا۔ بہرحال میں نے بچپن میں صحیح والا روزہ سات سال کی عمر میں رکھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کبھی دس روزے، تو کبھی بیس رکھ لیے۔ آخر کار میں نے اپنی زندگی میں رمضان کے پورے روزے سولہ سال کی عمر میں رکھنا شروع کیے جس کا سلسلہ زندگی کے ساتھ ساتھ اب تک جاری ہے۔ روزہ رکھنے سے قبل نمازِ تراویح کے لیے ہم بچپن میں کبھی آٹھ رکعت پڑھ کر گھر بھاگ آتے تو کبھی بارہ، اسی طرح جب رمضان کے پورے روزے رکھنے کی عادت اپنائی تو تراویح میں بیس رکعت پوری ادا کرتے اور مکمل قرآن سنتے۔ نامور شاعر سرفراز شاہد مرحوم کا ایک شعر شدت سے یاد آرہا ہے کہ:

شاہدؔ سے کہہ رہے ہو کہ روزے رکھا کرے
ہر ماہ جس کا گزرا ہے رمضان کی طرح

رمضان المبارک کے مہینے میں سحری کے وقت بہت سے لوگ جدید سہولیات کی وجہ سے موبائل کے الارم سے جاگ جاتے ہیں، کبھی ایسے سنہرے دور بھی ہُوا کرتے تھے جب ہم ”اماں“ کی ڈانٹ کھانے سے، کبھی مساجد کے لاوڈ سپیکروں سے گونجنے والی آوازوں سے، کبھی گلی میں ڈھول بجانے والے کی تھاپ سے، کبھی بڑی بہن کی نٹ کھٹ سی شرارتوں سے سحری کے وقت نیند سے بیدار ہوتے۔ اُن دنوں ہم گھر والے سحری کے وقت اپنے عزیز و اقارب کے گھروں پر دستک دیتے ہوئے اُن کو روزہ رکھنے کے لیے اُٹھاتے یا اُن کو فون پر اطلاع دیتے کہ سحری کا وقت ختم ہونے میں اتنا وقت رہ گیا ہے۔ اب بھی وقت اور شکلیں وہی ہیں بدلا تو صرف انسان اور اُس کی سوچ۔ وگرنہ آج بھی وہی راستے، وہی گلیاں، وہی ڈھول بجانے والے، وہی مساجدوں میں گونجنے والی صدائیں اور سحر و افطار کا وقت بتانے والے موجود ہیں۔ نہیں ہے تو وہ خون کے رشتوں میں احساس کی خوشبو اور سچی وفاؤں کا خلوص شامل جو کبھی پہلے ہُوا کرتا تھا۔ پہلے ہم لوگ ایک دوسرے کو ایک ساتھ سحر و افطار کرنے کی ضیافت دیا کرتے تھے، مگر اب نفسا نفسی کے دور میں انسانی رویوں میں اس قدر تبدیلی آچکی ہے کہ ایک ساتھ بیٹھنا تو دور کی بات ایک دوسرے کو اک نظر پیار سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے لیے بشیر بدر کا خیال کافی ہے:

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

رمضان المبارک میں سحر و افطار کے اوقات بدلتے رہتے ہیں، رمضان کے پہلے پندرہ دن نمازِ عصر ادا کرتے ہی گھر پر افطاری کا اہتمام کرنا اس دوران گھر کے دسترخوان پھلوں، کھانوں اور سموسے، چکوڑیوں سے سجا ہُوا ہوتا ہے۔ اس دوران فروٹ زیادہ اور کھانا کم کھایا جاتا ہے، پیاس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے لیمو پانی یا جامِ شیریں اور روح افزا کا شربت تیار کیا جاتا ہے۔ اس ماہِ مبارک میں ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عبادت اور دوسروں کی خدمت میں وقت گزارا جائے۔ اس لیے رمضان میں ایک قرآن پاک نمازِ تراویح میں سننے اور قرآن جتنا آسانی سے پڑھ سکے۔

اسی طرح رمضان میں بچوں کی روزہ کشائی کے حوالے سے بہت سی مساجد اور مدارس میں تقریبات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں بچوں کو روزہ رکھنے، نماز پڑھنے، صدقہ و زکوٰۃ، روزہ افطار کرنے جیسے موضوعات پر خاص درس دیا جاتا ہے، سوشل میڈیا کی بات کریں تو رمضان کے دوران بہت سی اچھی بچوں اور بڑوں کی تصاویر اور ویڈیوز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایسے میں کچھ لوگ رمضان کا احترام نہ کرتے ہوئے بھی بُرائی کا راستہ اپناتے دکھائی دیتے ہیں۔ بقول شاعر:

بُرائی چھپانے سے چھپ نہ سکے گی
خدا بھی تو دیکھو تمہیں دیکھتا ہے

رمضان میں زکوٰۃ اکٹھی کرنے کے لیے فلاحی ادارے خوب سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ادارے مستحق لوگوں کی مدد کرتے ہیں تو کچھ اپنا پیٹ بھرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ زکوٰۃ دیتے وقت گلی محلوں میں کچھ لوگ سارا سارا دن مردوں، عورتوں کے ہجوم کا میلہ لگا رکھتے ہیں اور افطار کا وقت ہوتے ہی گنتی کے چند افراد میں پیسے یا راشن تقسیم کرنے پر کچھ لوگوں کو غلیظ زبان کا سہارا لینے پر گالیوں کی برسات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کل صبح پھر آنا۔ اسی آس اور اُمید پر

گوجرانوالہ میں رمضان اور عید

نمائشی زکوٰۃ کے چکر میں بہت سی غریب اپنی ماں، بہن، بیٹیوں کی آبرو گنوا بیٹھتے ہیں۔ میرے خیال میں اللہ کے راہ میں مال کرچ کرتے ہوئے کسی بھی غریب عزیزوں اقارب کی محرومیوں کا تمسخر نہ اُڑایا جائیں ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اللہ کے حبیب حضرت محمدؐ کے فرمان کے مطابق ایک ہاتھ سے کسی کو دو اور دوسرے ہاتھ کسی کو خبر تک نہ ہو۔

رمضان سے دس دن قبل کچھ لوگ عید کی تیاریاں مکمل کر لیتے ہیں تاکہ روزے رکھنے کے دوران بازاروں کے چکر نہ لگانا پڑے۔ کچھ لوگ آدھا رمضان گزر جانے کے بعد بازروں کا رُخ کرتے ہیں۔ پاکستان کے دیگر شہروں کی طرح گوجرانوالہ کے بازروں میں بھی عید کی شاپنگ عروج پر ہوتی ہے۔ ان بازاروں میں گھنٹہ گھر چوک، گڑجاکھی دروزہ، صرافہ بازار، مچھلی بازار، قصاب بازار، سنیارا بازار، روئی بازار، سیالکوٹی دروازہ شامل ہیں، جبکہ راہوالی مارکیٹس، گوجرانوالہ مال، سٹیلائٹ ٹاؤن مارکیٹ میں بڑے بڑے برانڈوں پر رات گئے تک شاپنگ کے لیے لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی طرح عید راشن کے لیے دال بازار میں بھی حسبِ معمول سے زیادہ رش دیکھنے کو ملتا ہے۔

عید الفطر پر ہم ہر سال اپنا قومی لباس ''شلوار قمیض'' بڑے شوق کے ساتھ سلواتے ہیں، تاکہ پہلے دن اسے پہن کر عید کی نماز ادا کی جائے، دوسرے اور تیسرے دن کے لیے بازار سے پینٹ شرٹ اور جوتوں کی خریداری کرتے ہیں جبکہ گھر کی خواتین کی زیادہ تر ڈیمانڈز آن لائن کپڑے منگوانا، جیولری، مہندی پہلی ترجیحات ہوتی ہے۔ رمضان میں کپڑے سلائی کرنے والے ڈیلر کے دن بھی اچھے آئے ہوتے ہیں ہر شخص ٹیلر ماسٹر کو ڈھونڈ رہا ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں سے ہمیں وقت پر سوٹ سلائی ہُوا مل جائیں۔ ایسے میں ٹیلر ماسٹر بھی ضرورت سے زیادہ کا معاوضہ چارج کرتے ہیں وگرنہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ میرے پسندیدہ شاعر ناصر کاظمی کے ایک شعر کا پہلا مصرعہ کچھ اس طرح سے یاد آرہا ہے کہ:

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس لئے

رمضان میں سوشل میڈیا کو پہلے کی طرح مرد حضرات کم وقت دیتے ہیں جبکہ خواتین گیارہ مہینوں کی طرح ہی وقت دیتی ہیں تاکہ ڈرامے کی نئی قسط نہ نکل جائے۔ اس حوالے سے کبھی پھر تفصیل سے بات ہو گی، رمضان میں سحری اور افطار کے وقت ٹی وی پر رمضان ٹرانسمشن ہر گھر میں شوق سے دیکھی جاتی ہے۔ جس سے ایسے لوگوں کی عبادت میں خلل پڑتا ہے جو نماز کی پابندی نہیں کرتے۔ ہم بچپن میں پاکستان ٹیلی وژن کی رمضان نشریات نہ صرف سنتے بلکہ بہت کچھ سیکھتے بھی۔ اب موجودہ ٹی وی چینلز کی نشریات سے سیکھنے کو بہت کم ملتا ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ رمضان میں ہونے والی نشریات کی میزبانی کے فرائض ٹی وی اداکار اور مورننگ شو کے ہوسٹ کر رہے ہوتے ہیں، جو صحیح معنوں میں نہ ہی حافظِ قرآن اور نہ ہی دینی معاملات سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں پھر بھی ہمیں پورا رمضان دین سمجھانے میں لگے ہوتے ہیں جیسے ہی رمضان گزرتا ہے ہمیں اداکاری کے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

عید الفطر کے موقع پر ہر شخص کی ملک وملت کی سلامتی کے لیے دُعا ہوتی ہے کہ آنے والا ہمارا ہر دن اچھا اور یادگار ثابت ہو۔ نمازِ عید ہم گھر کے قریب مسجد میں ادا کرتے ہیں جہاں قریبی رشتے دار اور محلے دار ایک ساتھ محبت کی خوشبو بانٹتے اور دلوں سے کدورتوں کو مٹاتے نظر آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کبھی ہمارے دور میں رشتے داروں اور دوستوں کو عید کارڈ بھیجنے کی روایت عام تھی جو جدید وقت کے ساتھ مستقل ختم ہو کر رہ گئی۔ اُس زمانے میں ہم عید کارڈ میں کسی کو پھول، محبت بھری باتیں بھیجا کرتے تھے۔ اب عید کارڈ کی بجائے ہم عید نماز پڑھ کر خاص خاص لوگوں کو واٹس اپ پر عید مبارک کہہ کر گزارا کر لیتے ہیں۔ قمر بدایونی کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

سمندر پار بچوں اور عزیزوں کی بات کریں تو عید پر اُن کو ویڈیو کال پر عید مبارک کہنے اور سننے سے آنکھیں اشکِ تر ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اُن کی موجودہ شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ آخر میں مسافروں، عام شہریوں، غریبوں کے لیے سراہ افطار کا جو اہتمام کیا جاتا ہے وہ کچھ جگہوں پر سراہنے کے قابل بھی ہے کچھ جگہوں پر نہیں بھی۔ کیوں کچھ لوگ دکھاوے کے لیے بانٹتے ہیں تو کچھ لوگ اللہ کی رضا کے لیے۔ آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ رمضان کے مہینے میں جس طرح عبادت کو اپنا معمول بناتے ہیں باقی گیارہ مہینوں میں بھی اللہ کے گھروں کو آباد رکھا کریں، دوسروں کو کھانا کھلاتے رہیں اور غریبوں، بے سہاروں، عزیز رشتوں داروں کا خلوصِ نیت سے ساتھ دیتے رہیں۔ میری دُعا ہے کہ اللہ ہمارے رمضان کے روزے، عبادتیں، خدمتیں، دُعائیں اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں۔

☆☆☆☆

”بورے والا کی پہچان اب رانا محمد شاہد بن چکے ہیں۔ ”اطراف“ کے مستقل قلمی معاون، کسی بھی موضوع پر اطراف نے ان سے درخواست کی ہو اور وہ ایک دل کش تحریر نہ بھیجے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں بوریوالہ میں رمضان کیسے گزرتا ہے عید کی تیاریاں کیا کیا ہوتی ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

جب تک امّی حیات تھیں ہمیں کسی الارم سے جاگنے کی حاجت نہیں تھی

تحریر: رانا محمد شاہد، بورے والا

اب یہ تو یادنہیں کہ پہلا روزہ کب رکھا تھا۔ تھوڑا تھوڑا یاد ہے کہ امی کہہ دیتی تھیں، چڑی روزہ (دن بارہ، ایک بجے تک) رکھ لو۔ پورا روزہ ابھی نہیں رکھا جائے گا۔ ابھی چھوٹے ہو، تم پر روزے فرض نہیں۔ شاید ایسا کہہ کے وہ یہ ترغیب بھی دیتی تھیں کہ چوری چوری کچھ کھا، پی لینے سے بہتر ہے، جتنی ہمت ہے، اتنا رکھ لو۔ وقت کے ساتھ بہتری آتی جائے گی۔ مجھے اپنے پہلے روزے کی تفصیل تو یاد نہیں۔ البتہ گزشتہ دنوں شوگر چیک اپ وغیرہ کے لیے بڑے بھائی کے پاس بہاولپور جانا ہوا۔ ایک دن صبح فجر کی نماز کے بعد بھائی کچن سے کنو اور سیب اٹھا لائے تو میں نے سوال کر ڈالا کہ انہوں نے پہلا روزہ کب رکھا۔ انہیں یاد تھا۔ یہ 1970ء کے آس پاس کی بات ہوگی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ابھی میں نے سکول جانا شروع نہیں کیا تھا۔ ہم رائے ونڈ ریلوے کوارٹرز میں رہتے تھے۔ ابو ریلوے میں ملازم تھے۔ میں نے پہلا روزہ رکھا تو ابو میرے لیے موتی چور کے دو لڈو لائے۔ مگر میرے علم میں نہیں تھا۔ ابو نے لڈو لا کے ڈولی میں رکھ دیئے کہ ان دنوں فریج تو ہوتا نہیں تھا۔ افطاری سے دس منٹ پہلے امی، ابو اور میں کچن میں بیٹھے تھے۔ امی نے کہا آج شوکت (بیٹے) کے لیے جو لڈو لائے تھے، وہ کہاں رکھے ہیں۔ ابو نے بتایا کہ ڈولی میں رکھے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی اٹھتا اور لڈو لاتا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور ڈولی کے پاس پہنچ گیا۔ امی نے چپکے سے آ کے دیکھا کہ میں لڈو کھا رہا ہوں۔ حالانکہ ابھی افطاری میں کچھ وقت رہتا تھا۔ مگر لڈو کا سن کر مجھ سے صبر نہیں ہوا۔ اس وقت میری عمر سات، آٹھ سال ہوگی۔ پورے روزے میرے خیال میں کالج دور میں رکھنے شروع کیے تھے۔ کوشش تو ہوتی تھی کہ پورے روزے رکھے جائیں۔ مگر پھر بھی کچھ روزے چھوٹ جاتے تھے۔ کچھ بیماری کی وجہ سے اور کچھ نیت میں کھوٹ کی وجہ سے۔ سکول/کالج کے زمانے میں شوق سے تراویح پڑھا کرتے تھے۔ ابتدائی روزوں میں ایک جوش ہوتا تھا۔ چنانچہ چند دن 20 تراویح اور پھر آٹھ پہ آجاتے تھے۔ پھر وہ بھی چھوڑ دیتے تھے۔ پھر ابتدائی دنوں کا جوش آخری عشرے میں جاگ جاتا تھا۔ طاق راتوں میں 8 تراویح اور ستائیسویں شب کو 20 تراویح خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ بلکہ اس کے بعد مسجد میں تقسیم ہونے والی شیرینی کا لفافہ بھی حاصل کر کے اٹھتے۔ لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ شرماہٹ آڑے آجاتی۔ کرونا کے بعد سے تراویح گھر میں پڑھنے لگے اور اب اس میں سستی ہونے لگی ہے۔ بچپن سے ڈائری لکھنے کا بھی شوق رہا۔ رمضان المبارک کے خاص ایام اور عیدین پر بطور خاص ڈائری لکھتا۔ چنانچہ بچپن کے رمضان اور عیدین کی بہت سی یادیں ان ڈائریوں میں

نمازِ عید ٹاؤن ہال کے میدان میں

محفوظ ہوں گی۔ والدین کی زندگی میں جو رمضان اور عیدیں آئیں۔ ان کی خوشی شاید لفظوں میں بیان نہ کی جا سکے۔ شاید یہ خیال اس لیے بھی ہے کہ وہ دائمی جدائی دے گئے ہیں۔ یعنی ان کی زندگی میں خوشیوں اور بے فکری کا اندازہ نہیں تھا۔ امی ابو کے ساتھ سحری اور افطاری ایک خوبصورت یاد ہے۔ ان کا کس طرح ہمیں سحری کے لیے جگانا، عبادت پر زور دینا اور افطاری میں ہماری خواہشات کا خیال رکھنا۔ وسائل نہ ہونے کے باوجود کوشش کرتے کہ بچوں کی پسند افطاری کے دسترخوان کی زینت بنے۔ جب تک امی حیات تھیں تو ہمیں کسی الارم، ٹائم پیس یا ڈھول سے جاگنے کی حاجت نہ تھی۔ یعنی ہم بے فکری سے سو جاتے۔ امی شروع کے ایک، دو روزوں میں ٹائم پیس کا سہارا لیتیں۔ مگر پھر ان کی روٹین بن جاتی۔ سحری سے ایک، دو گھنٹہ پہلے خود بخود ان کی آنکھ کھل جاتی۔ تہجد اور نوافل پڑھتیں اور پھر کچن میں چلی جاتیں۔ سحری کے اختتام سے تقریبا آدھا گھنٹہ پہلے ہمیں اٹھا دیتیں۔ سحری کے وقت ان کے کہے جملہ" جلدی اٹھو، بیس منٹ رہ گئے ہیں، پراٹھا تیار ہے۔ سالن، دہی برتنوں میں ڈال دیا ہے۔ اب تم نے صرف کھانا ہے"۔ ہمارے سحری کرتے کرتے امی چائے ڈال دیتیں اور جلدی جلدی پینے کا کہتیں کہ ہم نے سحری آخری لمحات بلکہ آخری اذان تک لے جانی ہوتی تھی اور انہیں ہماری اس عادت کا پتا تھا۔ کبھی ہم امی کی آواز کو خاطر میں نہ لاتے تو وہ ابو کو کہتیں۔ چنانچہ ابو دو، تین دفعہ کہتے اور پھر رضائی کھینچ کر سائیڈ پر کر دیتے۔ یوں ہمیں اٹھنا پڑتا۔ امی کہتیں۔ ”سحری کر لو، نماز پڑھ لو، پھر جتنا چاہو سوئے رہنا"۔ کبھی ہم نیم نیند میں ہی سحری کرتے اور فورا رضائی میں گھس جاتے۔ ابو مسجد چلے جاتے اور امی کچن سمیٹتے۔ یوں ہماری طرف توجہ نہ رہتی کہ نماز پڑھی ہے یا نہیں۔ امی ابو کی زندگی میں جب بہن بھائی بھی ساتھ ہوتے تھے تو کبھی سحری، افطاری میں سب اکٹھے بیٹھتے۔ سحری، افطاری برآمدے میں دسترخوان بچھا کر کی جاتی تھی۔ اب تو ہم میاں بیوی ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں۔ بیگم تھوڑی دیر پہلے اٹھتی ہے۔ سحری بناتی ہے۔ میں کرتا ہوں۔ پھر وہ کر لیتی ہے۔ سحری کے وقت پراٹھا، سالن، دہی پہلے بھی ہوتا تھا، اب بھی ہے۔ کبھی سالن کی جگہ انڈہ آجاتا ہے۔ اب تو 8 سال سے شوگر ہے۔ ورنہ پہلے سحری کے اختتام پر کھجور کھانے کی عادت تھی۔ ابو معمول سے ہٹ کر بھی کھجور لاتے رہتے تھے۔ چنانچہ اکثر میری سحری کا اختتامیہ اور افطاری کا ابتدائیہ کھجور سے ہوتا تھا۔ افطاری کی ابتدا تو سبھی کھجور سے کرتے ہیں مگر سحری کا اختتامیہ بہت کم۔ رمضان المبارک میں اوقات کار بدلنا فطری امر ہے۔ میرا لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو رمضان میں یہ کام زیادہ اور بہتر انداز میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ سارا دن کھانے، پینے سے فراغت ہوتی ہے۔ چنانچہ عبادت اور لکھنے پڑھنے کو زیادہ وقت مل جاتا ہے۔ افطاری گھر میں ہی ہوتی ہے۔ بلکہ اپنی شائی طبعیت کی وجہ سے کوئی افطاری پر بلائے بھی تو مشکل ہو جاتی ہے اور اکثر نہیں جاتا۔ ابو 2018ء کے رمضان المبارک کی دس تاریخ کو اللہ کے حضور پیش ہو گئے تھے۔ دوسرے روزے کو محلے میں ایک گلی چھوڑ کر افطاری تھی۔ ان کے بار بار اصرار پر ابو اور میں بمشکل افطاری کے لیے گئے۔ ابو کے نزدیک یہ افطار پارٹیاں کھانے کی حرص، فضول گپ شپ کے سوا کچھ نہیں۔ پھر ان مقدس ایام میں یہ افطار پارٹیاں قیمتی

رُکو انور (رخسانہ انور) اُردو کے لازوال شاعر محسن بھوپالی کی صاحبزادی ہیں) اظہارِ خیال کے لیئے دل جمعی موروثی ہے۔ ہماری درخواست پر انھوں نے بچپن کا رمضان اور بچپن کی عید بہت ہی دل نشیں انداز میں پیش کی ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔

دونوں بہنوں کی روزہ کشائی خوب بہتر افطاری

تحریر:..............رکوانور۔کراچی

سردیوں کی رات اچانک کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھلی تو نیند اچاٹ ہوگئی۔۔آوازیں باورچی خانہ سے آ رہی تھیں جا کر دیکھا امّی ڈیڈی ناشتہ کر رہے ہیں انڈے پراٹھے قیمہ۔۔ کچھ دیر تک تو مجھے وہ چینی کہانی یاد آ گئی جس میں ماں باپ رات کے وقت چُپکے سے پکا کر کھاتے ہیں اور بچے کچن کی چیزیں چھپا لیتے ہیں اور آخر کار سارے بچّے اٹھ کر سب کھا جاتے ہیں اور ماں باپ پھر بھوکے رہ جاتے ہیں تہیں نہیں مگر ہمارے والدین ایسا نہیں کر سکتے کہ نہ تو ہم تعداد میں دس بارہ تھے اور نہ ہی کھانے کی مشکل۔۔ اتنے میں چچا اٹھ کر آئے اور کہنے لگے بھئی یہ سحری میں کیسے اٹھ گئی۔۔؟ اس کی آنکھ کھل گئی ۔۔اور امّی نے ساتھ بٹھا لیا اور ہم انڈہ پراٹھا کھانے لگے۔ اور کھا کر بستر میں غُڑپ۔

گلابی رنگ کا جوڑا سونے کے ٹیکے

صبح اٹھ کر سب کو بتایا کہ ہم سحری میں اٹھے تھے تو باقی بہن بھائی تو جیلس ہوگئے اور امّی سے شکایت کرنے لگے ہمیں کیوں نہیں اٹھایا ۔۔ یہ بات حیدرآباد کی ہے جب ہم بہت چھوٹے تھے اور سحری میں اٹھنا بڑے اعزاز کی بات ہوتی تھی۔ جب ہی روزہ کُشائی کا پتہ چلا کہ دادی دادا نے کہا کہ اگلے سال ان دونوں بہنوں کی روزہ کُشائی کرنی ہے سو وہ رمضان بھی آ گیا اور انتیسواں روزہ رکھا خوب بہتر افطاری کروائی گئی دودھ جلیبی دادی نے اپنے ہاتھ سے کھلائی، دادا ابّا نے پانی پلا کر روزے کی دُعا پڑھوا کر روزہ رکھوایا اور فجر پڑھوا کر سُلا دیا صبح دیر تک سُلا کر اٹھایا صبح نہلا دھلا کر نیا جوڑا پہنایا گیا۔۔ سردیوں کے دن تھے دادا ابّا اور پھوپھیوں کے بچے اور ہم سب باغ گئے راستے میں کھانے پینے کی چیزیں دِکھیں تو خریدنے کا کہا مگر دادا ابّا نے اَن سُنی کر دی اور کزنز نے خوب مذاق بنایا کچھ سمجھ نہ آیا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔۔؟ خوب گھوم پھر کر گھر واپس نماز پڑھا کر سُلا دیا گیا شام میں جلدی جلدی تیار کیا گیا نفیسہ پھوپھی نے گلابی رنگ کا بروکیڈ کا فراک شلوار اور دوپٹہ تیار کیا تھا ہم دونوں بہنوں کو وہی پہنایا گیا۔۔ امّی نے سونے کے ٹیکے بنوائے تھے وہ لگائے گئے اور روزہ کُشائی کی سب سے اہم سوغات نوٹوں کا ہار جو دادی نے خُود تیار کیا تھا اور ایک ایک روپے سوئی سے سی کر ٹانکے گئے اور اس کو پہن کر ایک خاص اطمینان ہوا کہ روزہ کُشائی کا مقصد پورا ہوا۔ دادا ابّا اور ڈیڈی کے دوستوں کی وجہ سے مردانے میں روزہ کھلوایا گیا سامنے افطاری کی انواع واقسام کی چیزیں اور ہماری نگاہ شربت کے جگ پر۔۔ روزہ کھلوا کر زنان خانے کا رُخ کروایا گیا اور دادی امّاں کی جاننے والی خواتین پھوپھیاں اور سب ہی نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہر ایک پیار سے کچھ نہ کچھ کھلا رہا تھا اور ٹیکے اور کپڑوں کی تعریف کر رہا تھا اور روزے کی مبارک باد، جب سب مہمان چلے گئے تو غوری اسٹوڈیو جو کہ لاڑکانہ کا واحد اسٹوڈیو تھا لے جایا گیا اور وہاں گروپ فوٹو بنے اور روزہ کُشائی پکچر بھی بنی۔۔ جو کہ بعد میں کم سِن روزدار کے پیج پر اخبارِ جنگ اور حُریت اخبار میں چھپی۔

کراچی شفٹ ہونے کے ساتھ ہی کلاسیں پھلانگتے پھلانگتے پانچویں اور پھر چھٹی کلاس میں روزے رکھنے شروع کئے اور جمعے اور اتوار کے روزے رکھنے لگے اور پھر تو حالت یہ تھی کہ ایک روزہ بھی نہیں چھوڑنا ۔اور بے سحری کا بھی رکھ لینا۔

ہم بہن بھائیوں میں سحری کرنے کے بعد باقاعدہ مقابلہ چلتا کہ کون کتنا پانی پی رہا ہے پانی پی پی کر پیٹ کرّے ہو جاتے۔۔ مگر اللہ اکبر تک پیٹ پانی بھرے جاتے کہ نماز مشکل ہو جاتی امّی ڈانتیں بھی کہ اسقدر پانی نہ پئو۔۔ واقعی صبح اٹھ کر لگتا کہ پانی پینا تو بھول ہی گئے تھے۔

بچپن میں سائرن بجایا جاتا تھا اور اس کی آواز کے بعد اذان کی آواز پر روزہ کھولا اور بند کیا جاتا اور ہر بار افطار وسحری کی دعائیں یاد کر کے پڑھی جاتیں۔۔ سحری میں اٹھانے والے بھی ہوتے گروہ کچھ زیادہ ہی جلدی آتے تو کوئی اُٹھتا تو نہیں سن کر کروٹ لے لیتے اور امّی تو الارم پر اٹھ کر سب کو اٹھا کر سحری بنانے لگتیں اور سب ایک دوسرے کو اٹھانے کا فریضہ ادا کرتے ڈیڈی تو آخری پندرہ بیس منٹ پر اٹھتے اور سحری کرتے۔۔۔ سحری میں تو وہی انڈہ پراٹھا دودھ پھینی جو مُلا احمد حلوائی کے ہاں سے خاص طور سے ڈیڈی جان لاتے ۔اور افطار میں خاصا اہتمام ہوتا پکوڑے سموسے سب گھر ہی میں امّی خود بناتیں۔۔ چنے کی دال مرچ مصحالے کے ساتھ بنتی کبھی دہی پھلکی کبھی میٹھی پھلکی کباب اور پھل عموماً کٹا ہوا۔۔ اور اخبار سے دیکھ کر کوئی نئی ترکیب بھی آزمائی جاتی۔ مغرب کی نماز کے بعد چائے اور پھر پانی کا دور۔

حیدرآباد سے تو اٹھائیس روزے پر لاڑکانہ یاترا اور ایک روزہ رکھ کر

جنگ اور حریت میں کم سن روزہ داروں کی تصویریں

عید۔۔ کراچی جب آئے تو لاڑکانہ یاترا چُھٹ گئی کیوں کہ دادی دادا بھی حیدرآباد آ گئے۔۔۔ پھر عید کے تیسرے روز حیدرآباد جاتے ۔۔، رمضان میں بھی ایک چکّر تو لگ ہی جاتا۔ کراچی میں رمضان اور اسکول بھی ساتھ چلتا تھا کلاس میں سب ایک دوسرے سے روزے کا ہی پوچھتے کہ کس کا روزہ ہے اور کس کا نہیں۔

محلّے پڑوس میں افطاری بھی ایک دوسرے کے گھر بھیجی جاتی اور پڑوس کی افطاری بھی شوق سے کھائی جاتی۔۔ دوازے پر کوئی فقیر آتا تو اسے بھی افطاری دی جاتی۔ امّی عموما چودھویں روزے جسے منجھلا روزہ کہا جاتا پر ڈھیر افطاری بنا کر مسجد بھیجتیں کہ دیگر مسلمان مولوی صاحب اور مسافر بھی روزہ افطار کرسکیں ۔، شبِقدر پر ڈرائینگ روم میں قالین پر سفید چاندنی بچھائی جاتی اور سب بہن بھائی امّی مل کر عبادت اور نوافل ادا کرتے امّی بتاتی جاتیں کہ اب کیا پڑھنا ہے اور کون سی تسبیح پڑھنی ہے اور یہ سلسلہ سحری اور فجر تک رہتا۔ اس وقت پی ٹی وی کا دور تھا وہ بھی وقت پر اُٹھتا اور سوتا تھا۔۔ سب بھی وقت پر سوتے اور اُٹھتے تھے اور ٹی وی بھی افطار کے بعد دیکھا جاتا۔۔ اس وقت رمضان ٹرانسمیشن کی وبا نہیں پھیلی تھی اور رنگ برنگے اینکر اور طرح طرح کے عالِم اور مولوی بھی نہیں تھے اس لیے سادہ دور جلد ہی گزر گیا۔ کیا دن تھے کیا راتیں خُلوص و محبت کی برساتیں۔۔ رشتوں کی پہچان، عبادت میں سادگی اور محبت رواداری وضع داری۔۔ کیا کچھ نہیں تھا بس بناوٹ نہیں تھی۔

لیجئے رکو انور صاحبہ کی بچپن کی عید بھی ملاحظہ کیجئے۔ بہت دل گداز، دل نشیں، نظر نواز۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے کس طرح غیر محسوس طریقے سے اپنی اقدار، روایات اور تمدّن کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ سندھ کی عظیم تہذیب کی ہلکی سی جھلک بھی

روزہ کھولتے ہی اوپر والے صحن سے چاند کی ڈھنڈائی

تحریر:...............رکو انور۔ کراچی

رات بارہ بجے کے اندھیرے میں ریل گاڑی۔۔۔سیٹی کی ایک چیخ کے ساتھ رُکتی تو ہم بچے جو نیند میں ڈول رہے ہوتے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسٹیشن کو دیکھنے لگتے اور خُوشی سے نعرہ مارتے۔۔لاڑکانہ آ گیا۔۔!! اور دن بھر کا انتظار ختم ہوتا۔ اسٹیشن پر دادا ابّا، بڑے چچا رشید چچا اور چچا جان سب آئے ہوتے۔۔سلام دُعا کے بعد سامان نکالا جاتا امیّ بہت ذمہ داری سے سارا سامان رکھواتیں، دو تانگے بھر کر ہم چلنا شروع کرتے ۔۔راستے بھر تانگے میں بیٹھ کر کوچوان کی "ہل بابا" سے متاثر ہو کر کہ گھوڑا مالک کی آواز پر کیسے ٹک ٹک کرتا ہمیں گھر پہنچا دیتا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک رونق لگی ہوتی۔۔دادی امّاں نفیسہ

راستے بھر تانگے میں کوچوان کی ''ہل بابا''!

پھوپھی نعیمہ پھوپھی خُوب پیار کرتیں۔، چھوٹی پھوپھی، بڑی پھوپھی اپنے بچوں کے ساتھ موجود ہوتیں۔۔محبّتوں کی پھوار میں کوئی پانی پوچھتا کوئی کھانا غرض باتیں شروع ہو جاتیں ۔۔ ہم بچے اپنے پھوپھی زاد بہن بھائیوں کے ساتھ اوپر لکڑی کے بنے ہوئے مخصوص زینے سے اوپر دوسری منزل کے صحن کا چکّر لگا کر دس مرتبہ اترتے چڑھتے۔

پھر سامنے لمبی سی گلی سے گذر کر بڑی پھوپھی کے گھر پہنچ جاتے دروازے سے جھانک کر دوبارہ دادی کے گھر کہ بڑے تو سب یہاں ہوتے اِسی میں سب سحری کی تیاری شروع ہو جاتی۔۔کیونکہ کل انتیسواں روزہ ہوتا ہم بھی پھینی دودھ جلیبی اور آملیٹ کھا کر سحری کر لیتے۔، سونے کا انتظام دوسری منزل پر ہوتا۔۔بڑے سب نیچے کی منزل میں۔۔نعیمہ پھوپھی نفیسہ پھوپھی کے ساتھ ہی بچھی ایک چارپائی پر گرتے ہی سو جاتے۔ صبح اٹھتے ہی ایک چمکدار دن موجود ہوتا۔۔سب سے بڑا مرحلہ یہاں کے باتھ روم ہوتے باتھ روم کیا۔۔؟ ایک کھلے آسمان کے نیچے بنا ہوا کمرہ۔۔یعنی بغیر چھت۔۔ بہت ہی پس وپیش کے ساتھ نفیسہ پھوپھی کے گڑیا بنا کر دینے کے وعدے کے ساتھ استعمال کیا جاتا۔۔غسلخانہ تو اور متاثر کرتا۔۔یہ کیا۔۔؟ ایک ہینڈ پمپ ایک لوہے کی بالٹی اور ایک لوہے کا مگ۔۔ یا اللہ نلکا کہاں ہے۔؟ خیر کوئی بھی بڑا اس کو چلا کر پانی بھر دیتا۔۔ سب بچے نہا لیتے۔، مگر حسّرت ہی رہ جاتی کہ ہم سے بھی یہ ہینڈ پمپ چل جاتا۔ اب سب کا اصرار ناشتہ کر لو کہ بچّوں کا روزہ دس بجے تک ہوتا ہے۔۔اسی یقین پر ناشتہ کیا جاتا۔۔دن بھر سب سے باتیں کھیل کود اور اس حویلی کو دریافت کرنا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہندوؤں کی حویلیاں اُن مہاجرین کو الاٹ کی گئیں جو گورنمنٹ ملازمین آپشن پر پاکستان لکھوا کر آئے تھے۔ قائدِ اعظم نے گورنمنٹ سرونٹ کو آپشن دیا تھا کہ" پاکستان آئیں اور پاکستان کو سرو کریں" یہاں گورنمنٹ چلانے کے لیے ان ملازمین کی ضرورت ہے۔ دادا ابّا دادی امّاں اپنے تین بچوں کے ساتھ پانی کے جہاز میں کراچی پہنچے اور ان کو لاڑکانہ اپائنٹ کیا گیا۔ دادا محکمۂ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ انہیں یہ حویلی ملی۔ ڈھائی منزل ایک بھول بھلیاں۔۔بڑے بڑے دروازے اور شیشے والی الماریاں، پتھّر کے فرش، طاق، دالان اوپر پکّے کمرے، کچے صحن، سب سے اوپر کچے کمرے اور صحن۔

عصر کے وقت افطاری کی تیاری اور روزہ کھلنے کا انتظار۔۔ روزہ کھولتے ہی پکوڑے ہاتھ میں لیے سب اوپر والے صحن سے چاند کی ڈُھنڈائی شروع کر دیتے، پھوپھیوں میں سے جس کو دکھا اس نے نعرہ لگا دیا اور ہم بچّوں کو دکھا کر دوڑے دوڑے بچے نیچے پہنچتے وہاں سے رشید چچا بڑے چچا جان شور مچاتے ہوئے اندر آتے کہ چاند ہو گیا۔۔سب کے چہرے کِھلے ہوتے۔۔ چاند کی مبارک دی جا رہی ہوتی۔، افطاری میں کسی کا دل نہ لگتا۔ نفیسہ پھوپھی مہندی گھولتیں امّی دادی امّاں باورچی خانہ سنبھالتیں۔ بھگوئے ہوئے بادام پستے کٹ رہے ہیں سویّاں نکالی جا رہی ہیں، نمکین کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ کمروں کے ساتھ ایک بڑا سا ہال جسے اب لاؤنج کہا جاتا ہے اس میں دادی امّاں ایک طرف بڑی سی رسّی لگواتیں اور سب کے نئے کپڑے جو استری ہو کر آتے، لٹکائے جاتے۔ اُن کے نیچے جوتے جمائے جاتے۔، سب مردانہ کپڑوں کے بعد خواتین اور ہم بچوں کے کپڑے جوتے۔ پھوپھیاں امّی مہندی لگانے بیٹھ جاتیں، نعیمہ پھوپھی ہم دونوں بہنوں کے ہاتھ میں مہندی لگاتیں۔۔۔ایک ہاتھ میں گولا اور دوسرے ہاتھ کو آدھا مُڑوا کر مہندی کا لونڈا سا رکھ

مرد نماز پڑھ کر آتے عید کی مبارک باد اور عیدیاں

دیتیں اور کہہ دیتیں کہ "اب مٹھی مت کھولنا" صبح مچھلی کا نٹا بنا ہو گا۔ سب سو جاؤ کل عید ہے۔۔! سب کب سو جاتے۔

صبح ایک آواز پر اُٹھ جاتے۔۔آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر سوکھی مہندی پھینک کر مچھلی تلاش کی جاتی،۔ اور بہت کوفت ہوتی کہ مچھلی تو کوئی نہیں ایک سفید سی ہتھیلی کو مچھلی نما کو مچھلی کہا جا رہا ہے۔۔ پھوپھی سے پوچھتے تو کہتیں یہی تو مچھلی ہے اب جلدی سے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ۔۔ عیدی بھی تو لینی ہے۔۔اپنا سامنہ لے کر تیار ہو جاتے۔۔سب گھر والی خواتین بھی تیار ہو کر مردوں کا انتظار کرتیں کہ کب نماز پڑھ کر آئینگے۔۔۔؟ سب آتے اور عید مبارک دی جاتی عیدیاں دی جاتیں۔۔ایک سیشن فوٹو شُوٹ کا بھی ہوتا، ڈیڈی جان کو تصویر کھینچنے کا بہت شوق تھا۔۔ دوپہر کا کھانا بڑی پھوپھی کے یہاں اور شام کا کھانا چھوٹی پھوپھی کے ہاں۔۔وہ بھی صبح میکے سلام کرنے اور عید ملنے آ جاتیں۔ اور پھر ہم سب ان کے گھر سارا دن کھانا پینا۔۔۔ بچّے بچّوں میں، بڑے بڑوں میں باتیں ملاقاتیں ہنسی مذاق بات چیت چہروں پر مُسکُراہٹیں، دلوں میں محبّتیں۔۔۔غرض عید کا دن گذر جاتا۔۔ پورے ایک سال کے لیے آپ سب کو بھی عید مبارک۔۔۔ جو باہر ہیں اور جو وطن میں ہیں۔

عمر کا سورج

”پاکستان کی سب سے سینئر اخبار نویس خاتون ناول نگار افسانہ نویس سعیدہ افضل کی عنایت ہے کہ اپنی انتہائی اہم آپ بیتی کیلئے انھوں نے ”اطراف“ کے صفحات کا انتخاب کیا۔ہماری درخواست پر بھیجی گئی یہ تحریریں بہت زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ سعیدہ افضل جس طرح جزئیات کا احاطہ کرتی ہیں۔اس سے محققین کو پاکستان کے ابتدائی عشرے کے بارے میں بہت سے اعداد و شمار مل رہے ہیں۔“

قسط:18

1957 بابا کو بزنس میں گھاٹا

سعیدہ افضل کی خودنوشت

یہ 1957 کی بات ہے، میں ساتویں میں تھی والد صاحب کو بزنس میں گھاٹا آنا شروع ہوگیا، انھوں نے اپنے کاروباری شراکت دار محسن سے علیحدگی اختیار کرلی چونکہ ان کا تعلق میمن تجارتی برادری سے تھا جو کہ نسلوں سے تجارت کرتے آرہے تھے۔لہٰذا کاروباری رموز کو جانتے تھے۔محسن صاحب کو علیحدگی سے کچھ فرق نہیں پڑا،لیکن والد صاحب کا پشتنی تعلق زمنیداری سے تھا،وہ اپنے ”امپورٹ ایکسپورٹ“ کے بزنس کو نہ سنبھال پائے اور کاروباری اونچ نیچ کی باریکیاں بھی نہ سمجھ سکے، مالی خسارے کے سبب پریشانی میں کاروبار کو تہہ کیا۔ہمیں ایک بار پھر اپنے دادا کے پاس ڈیرہ غازی خان آنا پڑا کیونکہ کراچی کا فلیٹ فروخت کرچکے تھے۔

ڈیرہ میں بابا کا ایک گھر سی (C) بلاک میں تھا جو عرصے سے بند پڑا تھا، کبھی جس کو وہ اپنے ڈیرے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔اس کا رقبہ ڈیڑھ کنال سے بھی زیادہ تھا، کشادہ صحن کو ٹھیک ٹھاک کرایا، لان بنوایا، گھاس اور پودے وغیرہ کے لئے فوارا بھی بنوادیا اور ”ڈیرے“ کو رہائش گاہ میں تبدیل کرلیا، اس تعمیری کام کے دوران ہم دادا کے گھر مقیم رہے جو زیادہ دور نہ تھا۔

یہ رہائش لب سڑک موجودہ عظمت روڈ پر واقع تھی، اور اس کی عقبی جانب کے تمام بلاک انگریزی حروف تہجی سے شروع ہوتے تھے، تقسیم سے قبل ان تمام بلاکوں میں ہندو آباد تھے، ان کے جانے کے بعد خالی گھروں میں مہاجرین آباد ہوگئے، چونکہ ہمارا گھر سی بلاک مہاجرین کی آبادی میں شامل ہوگیا تھا، لہٰذا عقبی بلاکوں سے ہجرت کرکے آنے والی خواتین کا آنا جانا زیادہ رہنے لگا۔ ان میں سے کچھ خواتین سے میری اماں کی دوستی ہوگئی وجہ یہ تھی کہ یہ نئے آباد کار سرائیکی بول سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے۔جبکہ ہم لوگ گھر میں زیادہ تر اردو میں بات کرتے تھے زبان کی سہولت کے سبب ان خواتین کو میری والدہ سے انسیت اور لگاؤ محسوس ہوتا تھا، وہ اماں کو ہجرت کے سفر کی مصیبتیں اور جو اُن پر بیتی وہ قصے سنایا کرتی تھیں۔ان میں سے اکثر مالی لحاظ سے ابھی تک مستحکم نہ ہو پائے تھے۔اماں ضرورت مند خواتین کی مدد کرتیں، اراضی سے آئی پیداوار میں سے اناج، چاول، دالیں گندم چنا کپاس یہاں تک کہ موسم کی فصل سے آم کھجوریں، مٹر، پیاز بھی انھیں دیتیں چھاجوں بھر کر دیتیں۔ ہمارے گھر میں بھینس تھی دودھ واحد وافر مقدر میں ہوتا، کچھ عورتیں جو بدحالی کا شکار تھیں دودھ، لسی، کے علاوہ اوپلوں کے لئے گوبر بھی لے جاتیں۔یہ لوگ محنت کش تھے۔

ہمارے پڑوس میں جس کنبے کو گھر الاٹ ہوا تھا وہ حیدرآباد دکن کے لوگ تھے، خاتون جن کو ہم حیدرآبادی خالہ کہتے تھے۔خوش مزاج اور سگھڑ تھیں اور بہت میٹھی حیدرآباد دکن کی اردو بولتی تھی۔انھوں نے امی کو کئی طرح کے حیدرآبادی کھانے بگھارے بیگن اور اچار، چٹنیاں بنانا سکھائیں۔اس خاتون کا شوہر حلوہ بنانے کا ماہر لگا ان کے چار بیٹے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی تھے۔ابوبکر کو میرے والد صاحب کراچی جاتے ہوئے ساتھ لے گئے جہاں اس نے ان کے دفتر میں کچھ عرصہ ملازمت کی عمر نے اپنے باپ کا کام سنبھالا اور ڈیرہ میں عمر کا سوہن حلوہ۔بانی کے سوہن حلوے کے بعد دوسرے نمبر پر مشہور ہوا، عثمان نے پراپرٹی ڈیلر کا کام کیا اور یوں یہ لوگ رفتہ رفتہ خوشحال ہوگئے خاص طور پر عثمان۔ بعد میں یہ لوگ جب کبھی میرے بیٹوں سکندر اور حیدر سے ملے ان سے میرے والد کی بہت تعریف کی عثمان نے کہا میں نے افضل خان جیسا سخی دل انسان نہیں دیکھا۔میرے بچے اکثر سوہن حلوہ بطور سوغات کراچی لے جاتے تو عثمان کی دوکان سے خریدا کرتے تھے۔

یہ وہ پڑوس کے لوگ ہیں جنھوں نے ڈیرہ میں عرصہ تک ہمارا رہن سہن دیکھا تھا۔

اسکول میں جمعہ خانہ داری کا دن ہوتا تھا

(میری والدہ (C) بلاک والے اس گھر میں آکر بہت خوش تھیں کیونکہ سڑک پار ہمارے نانا مرحوم محمد شفیع کا آبائی مکان تھا جہاں اماں کا بچپن گزرا تھا۔انگریز حکومت کے دور میں نانا جب سکالرشپ پر انجنیئر نگ

فلم ڈائریکٹر دانش ماموں ہارون اسٹوڈیو میں ایک غیر ملکی اداکارہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے

کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ جانے لگے تو اپنے اہل خانہ کو اپنے سالے محمد اعظم کو سونپ گئے۔

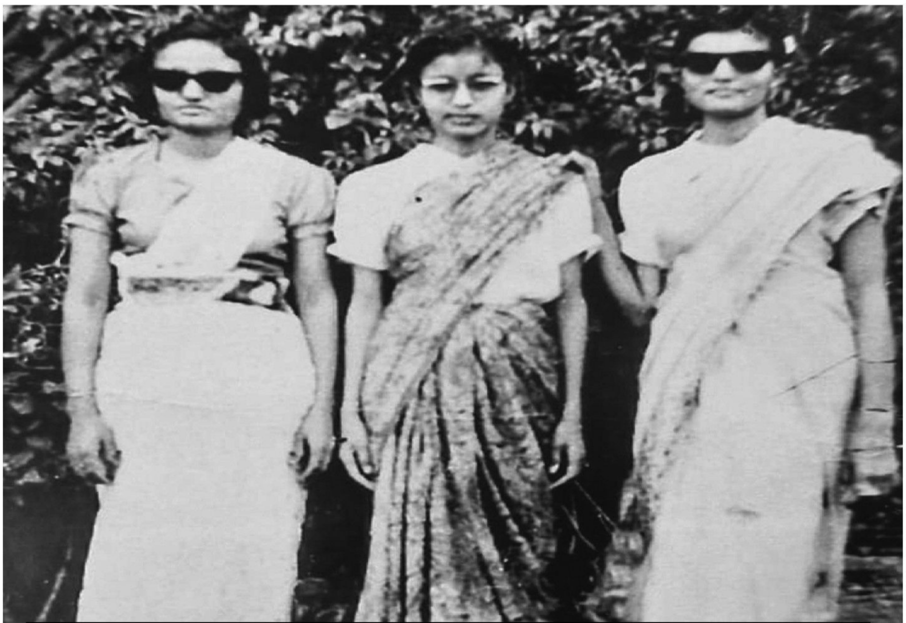

دائیں سے بائیں، سعیدہ افضل، کزن شمیم دانش اور ممانی (پھوپھی دلشاد) بیگم دانش ڈیروی

امی کی شادی ہوگئی پھر ماموں اور نانی کراچی چلے گئے اس کے بعد جب نانی کراچی سے ڈیرہ آئیں اپنے مرحوم شوہر کے اسی گھر میں اپنے بھائی اعظم صاحب کے پاس ٹھہرتی تھیں۔ میں ان کے گھر ان کے بچوں سے

اُردو مشترکہ زبان ہونے سے مہاجر خواتین کی مری ماں سے دوستی ہوگئی

کھیلنے جاتی بعد میں میرے ماموں نے اس گھر کو اپنے پڑوسی اقبال غوث وکیل کو فروخت کردیا۔ جنھوں نے گھر کی عمارت کو گرا کر یہاں مارکیٹ تعمیر کرادی یہ مارکیٹ اب بھی یہاں جامع مسجد کے عقب میں لب سڑک موجود ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ جیسے دنیا کے نقشے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی مکین اور ان کے گھروں کے نقشے بھی بدلتے ہیں، لیکن اب بھی جب میں وہاں سے گزرتی اور اس مارکیٹ پر نظر پڑتی جو کبھی میرے نانا کا گھر تھا مجھ کو نانی کے گھر کا آنگن یاد آجاتا ہے۔

اب مجھے سکول میں داخلہ لینا تھا اس وقت گورنمنٹ گرلز ہائی سکول نمبر ا ہی لڑکیوں کا واحد سکول تھا تمام شہر کی لڑکیاں اسی سکول میں پڑھنے آتی تھیں۔ میں نے بھی آٹھویں، نویں دسویں اسی سکول سے پاس کی۔

جب ساتویں میں داخلہ لینے گئی۔ تب سالانہ امتحان میں صرف تین ماہ باقی تھے، ہیڈ مسٹرس مسز نرگس طفیل صاحبہ تھیں، انھوں نے کہا۔

کراچی کا نصاب دوسرا ہے اور یہاں ساتویں کا نصاب مختلف ہے کیا تم تین ماہ میں نیا نصاب مکمل کر پاؤ گی۔

جی میں کرلوں گی، آپ مجھے موقع دیں ورنہ میرا سال ضائع ہو جائے گا۔

انھوں نے میری جانب غور سے دیکھا اور داخلہ دے دیا۔ ان دنوں بجلی کبھی کبھار، برائے نام ہی آتی تھی۔ میں نے "لال ٹین" کی روشنی میں پڑھا اور ساتویں کا امتحان اچھے نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا۔

ہیڈ مسٹرس میرا رزلٹ دیکھ کر خوش ہوئیں۔ دراصل مسز نرگس طفیل اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں انڈیا میں کسی اچھے تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل تھیں اور اعلیٰ منتظم تھیں ان کا خاندان بھارت سے ہجرت کر کے ڈی آئی خان میں سکونت پذیر ہوا تھا۔ یہاں ان کو کلیم میں، بہت شاندار گھر الاٹ ہوا جو کسی ہندو وکیل کی ملکیت تھا۔ علاوہ ازیں قیمتی زرعی اراضی اور ان کے بہن بھائیوں کو بھی شاندار مکانات کلیم میں ملے یہ خاندان ہمارے شہر کے معززین میں شمار ہونے لگا۔

مسز طفیل تب سکول میں اپنی پستہ قد خاص نسل کی پالتو کتیا کی زنجیر تھامے آیا کرتی تھیں۔ وہ ایک لیڈیز کلب بھی چلاتی تھیں جس کی ممبرز بیوروکریٹس کی بیگمات اور شہر کے معززین کی بیگمات ہوتیں جب شادی ہو کر میں ڈیرہ گئی انھوں نے مجھے بھی کلب کا ممبر بنایا۔

سکول میں ان کا استانیوں اور طالبات پر بہت رعب تھا حالانکہ وہ بلاوجہ کسی کو ڈانٹتی نہیں تھیں۔ کہنے کو سکول نمبر ۱۱ چھوٹے سے شہر کا تعلیمی ادارہ تھا۔ مگر رقبہ میں بہت بڑا تھا سکول کی عمارت انگریزوں کے زمانے کی بنی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے گراؤنڈ (جن کو مسز طفیل کی توجہ اور محنت نے گل وگلزار بنادیا تھا) کھلے کھلے کلاس روم، پختہ اسٹیج اور لائبیریری لڑکیوں کا ہاسٹل بھی تھا احاطے کے اندر ایک جانب کچھ دوری پر سکول کے ملازمین ہوسٹل کی مکین لڑکیوں کے لئے کھانا بنانے والے، اور مالیوں وغیرہ کے لیے سرونٹ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ (اس گرلز سکول کے اُدھر بوائز کا سکول تھا۔) دیہات اور شہر کے قریبی مضافات سے جو لڑکیاں پڑھنے کے لیے شہر ڈیرہ آتیں ان کے لئے ہوسٹل میں رہائش کی سہولت موجود تھی۔ سکول کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا۔ انگریزی چھٹی کلاس سے بڑھائی جاتی۔ اور انگریزی تعلیم کا آغاز اے، بی، سی، ڈی کے قاعدے سے شروع ہوتا۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں یہ سکول کسی شہر کے سکول سے پیچھے نہ تھا۔ کھیلوں کی ٹیم کو لاہور مقابلے میں بھیجا جاتا اور اکثر ہماری ٹیم جیت کر آئی۔

ایک دن داخلہ ہوا اور دوسرے روز سکول میں پہلا دن تھا کہ چھٹی کا اعلان ہوگیا۔ پتہ چلا ساتویں یا آٹھویں کی ایک طالبہ زرینہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کی خوبصورتی تمام سکول میں مشہور تھی۔ بعد میں سنا کہ ایک تمن دار سردار کی بیٹی تھی جو 50 بلاک کی مکین نگینہ نامی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ (یہ لڑکی ماں کے پاس پنجھا (50) بلاک میں رہتی تھی اس کو بازار حسن کہہ لیں جب نیا ڈیرہ انگریزوں نے تعمیر کرایا تو شہر کے آخری بلاک نمبر 50 کو طوائفوں کے لئے مخصوص کردیا گیا تھا۔ بہر حال کہانی یہ مشہور ہوئی کہ لڑکی کا والد سردار صاحب "بچی کو ملاقات کے لئے ساتھ لے گیا اور زہر دے کر قتل کرادیا۔ لڑکی کا جرم یہ لگا کہ طوائف کے بطن سے جنم لیا تھا) سردار صاحب کا نام میں یہاں نہیں لکھوں گی، یہ بہت افسوس ناک واقعہ تھا جس پر سارے شہر میں چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔

انگریز حکومت کے دور کو ختم ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے تھے آزادی مل چکی تھی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک انہی کے دور کا نصاب تعلیم چل رہا تھا۔ معاشرتی علوم کے طور پر جو کتاب پڑھائی جاتی تھی وہ قدیمی انسانی ارتقاء سے قبل کی معلومات پر مبنی تھی انسانوں کا غاروں میں رہنا، پتھر اور پھر لوہے کے اوزاروں کا زمانہ ڈارون کی

طوائف کے بطن سے جنم لینے والی طالبہ کو سردار باپ نے قتل کروادیا

تھیوری وغیرہ باتصویر اس کتاب کی طباعت نہایت عمدہ واعلیٰ تھی کاغذ بھی عمدہ قسم کا تھا کتاب اتنی دلچسپ کہ پڑھنے میں مزہ آتا تھا۔
ہسٹری میں دو کتابیں شامل تھیں ایک تاریخ انگلستان جس میں ہمارے آقاؤں کی تاریخ، انگلستان یعنی انگریز بادشاہوں کے ادوار اور حالت زندگی مثلاً ایڈورڈ اول۔ دوئم۔ سوئم چہارم ہفتم ہشتم ملکہ میری، ملکہ وکٹوریہ ملکہ الزبیتھ، اول دوئم سوئم اور چل سوچل ---۔ انگلستان کی اس ضخیم ہسٹری سے نجانے ہمیں کیا لینا دینا تھا۔ علاوہ ہندوستان کی قدیمی تاریخ

میں نے لالٹین کی روشنی میں ساتویں کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا

بھی لازمی مضمون میں شامل تھی، ہندو راجہ مہارا جاؤں کے دورِ حکومت ---۔ چانکیہ، چندر گپت موریہ، پھر مذہبی پیشوا گوتم بدھ، ہندومت، جین مت کے دور میں محمد بن قاسم راجہ پورس، راجہ داہر قدیمی تاریخی جنگیں مرہٹوں کی انگریزوں سے لڑائیاں ٹیپو سلطان، حیدر علی،

سعیدہ افضل طالبہ میٹرک ڈی جی خان

تمام مغل بادشاہوں کے ادوار اور مشہور جنگیں۔ التمش کا دور، رضیہ سلطانہ کا دورِ حکومت، محمود غزنوی، کے سترہ حملے۔ شیر شاہ سوری، قطب الدین ایبک سے تغلق اور غلاموں کی بادشاہی کا زمانہ تحریکِ آزادی جلیان والا باغ گا واقعہ انت بہادر شاہ ظفر کی سلطنت دہلی تا پالم -----۔ رنگون میں ان کی قید اور وفات غرض ---۔ اتنے ابواب اور اس قدر موٹی کتاب کہ ہسٹری کی معلمہ کو لڑکیاں سبق یاد کر کے نہ سنائیں تو وہ اس ضخیم کتاب کو ان کے سر پر زور زور سے مارتیں تب بھی کتاب کا کچھ نہ بگڑتا اور جلد سلامت رہتی میں سبق ہمیشہ یاد کر کے جاتی کیونکہ مجھے کلاس میں بے عزتی سے خوف آتا تھا۔ مجھے یاد ہے میری کلاس فیلو صابرہ فاروقی کی بڑی بہن جبین فاطمہ فاروقی سے جب استانی سے پوچھا---
ہر روز تم سبق یاد کر کے نہیں آتی ہو کیوں؟ وہ ایک نڈر لڑکی تھی۔ ---۔ بولی ---۔ (ہم سے اتنے لمبے لمبے گزرے زمانے کے قصے یاد نہیں ہوتے ---۔ اس پر استانی طیش میں آگئیں۔ اور انھوں نے جبین کے سر کی کتاب سے تواضع کر ڈالی اس روز مجھے استانی پر بہت غصہ آیا مگر بس نہیں چلتا تھا ہم ان کے سامنے کچھ بولیں۔
(ایک بتانے والی بات یہ ہے کہ ہسٹری کی کتاب میں جب کہیں تحریکِ آزادی 1857 کا ذکر آتا تو وہاں ''غدر'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نصاب انگریز کے دورِ حکومت میں مرتب ہوا وہی ابھی تک چل رہا تھا۔
(ریاضی میں ''دل کا حساب'' جو سیروں وزنی کتاب تھی ---۔ جس میں سو 100 سے اوپر مشقیں ہوں گی اور ہر مشق میں بیس 20 سے کم سوالات نہ ہوتے تھے۔ ہر مشق کے ایک ایک سوال کو ہم سے حل کرایا جاتا تھا۔، اب اگر کسی پرانی لائبریری میں یہ نصاب کی کتب موجود ہیں تو ان کو نئے طالب علموں کو ضرور دیکھنا چاہیئے خصوصاً دل محمد، کی تصنیف کردہ ریاضی کی کتاب یہ اس وقت آٹھویں یا نویں میں پڑھائی جاتی تھی بے شک اس پرانے نصاب کو معلومات کا خزانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔
اس دور کے استاد محنتی اور شاگرد بھی ان سے ڈرتے تھے۔
خاص بات یہ کہ تب وہاں انگریزی کا طالب علموں کو بڑا پرابلم رہتا تھا حالانکہ ساتویں آٹھویں کی انگلش کی کتاب آج کے دور کے لحاظ سے بے حد آسان تھی اس پر بھی لڑکیاں انگریزی میں دھڑا دھڑ فیل ہوتیں میں اپنے والد سے انگلش کی گرائمر گھر سے پڑھ کر جاتی کیونکہ ہماری انگلش ٹیچر بھی کچھ ایسی لائق فائق نہ تھیں ان کو بھی گرائمر پڑھانے میں دقت ہوتی وہ خود پہلے اپنے شوہر سے پڑھ کر آتیں اور بعد میں ہمیں کلاس روم میں پڑھاتیں اس کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتاب بھی نصاب میں شامل تھی۔
خدا خدا کر کے نویں پاس کی جس روز رزلٹ تھا سبھی لڑکیاں گراؤنڈ میں جمع ہو گئیں مگر میں کلاس روم میں دبک کر بیٹھ گئی دھڑکا تھا کہیں میرا رزلٹ اچھا نہ ہوا تو؟
رزلٹ اناؤنس ہوا اور میں دوئم نمبر پر تھی اول نمبر پر ایک ایڈوکیٹ کی بیٹی تھی حالانکہ وہ کلاس میں مجھ سے کم نمبر لیا کرتی تھی مگر ڈیرہ میں یہ چلتا تھا (اب کا حال معلوم نہیں) بہر حال میٹرک کا امتحان میں نے پنجاب بورڈ سے فرسٹ ڈویژن میں اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ تب صابرہ فاروقی (موجودہ رعنا فاروقی) میری کلاس فیلو تھی ہم نے ایک ساتھ میٹرک پاس کیا۔
سکول کی ہیڈ مسٹرس چونکہ پروگریسو ذہن کی تھیں وہ سکول کے نظام کو بہترین خطوط پر چاہتی تھیں صبح دم جب اسمبلی ہوتی آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوتا اس کے بعد علامہ اقبال کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا پڑھی جاتی۔) تین لڑکیاں باری باری ایک خبر سناتیں، جس روز میری باری تھی۔ میں نے اخبار سے فلسطینیوں کی جدوجہد آزادی کے بارے خبر منتخب کر کے اسمبلی میں پڑھی ---۔ یہ 1958ء تھا اور میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی، تب بھی ڈیرہ غازی خان میں ہمارے گھر جنگ اخبار آتا تھا مگر ایک روز کی تاخیر سے۔ سوچیے اس وقت بھی فلسطینی قوم شعلوں میں گھری ہوئی تھی ان شعلوں نے آگے چل کر جہنمی آگ کی صورت اختیار کر لی کتنی ہی ان کی نسلیں خاکستر ہو گئیں۔ آگ مگر آج بھی بھڑک رہی ہے۔
ہمارے سکول میں جمعہ خانہ داری کا دن ہوتا تھا۔ تب ہم چولہا، برتن، بھانڈے نیپکن، ٹرے اور کراکری اور جو ڈش بنانا ہوتی اس کے حساب سے پکانے کا سامان۔ نمک مرچ پیاز لہسن، ہر شے تانگے پر ڈھو کر لے جاتے۔
لڑکیاں نگراں خانہ داری کے سامنے اپنی اپنی ڈش پکاتیں ---۔ اور استانیاں ان کا تیار کیا ہوا کھانا چیک کرتیں نمبر لگاتیں یہ نمبر ہمارے سالانہ امتحان کی مارک شیٹ میں لکھے جاتے تھے جس کا اثر رزلٹ پر پڑتا تھا۔ سلیقہ شعاری کا امتحان ہوتا۔ مہمانوں کے سامنے کس طرح کھانا پروسنا ہے، میز کو سجانا، چھری کانٹوں کو ٹیبل پر لگانے کی ترتیب، گلاس کو کیسے پکڑنا یہاں تک کہ خوان پوش پر کڑھائی۔-- چھٹی سے لے کر آٹھویں تک سب طالبات کو خانہ داری کی یہ مشقت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ (جاری ہے)۔

اسلام کی تعلیمات اور مصنوعی ذہانت

”’اطراف‘ کے ڈیجیٹل ہونے سے ہمارے رابطے ان محترم اسکالرز سے ہو رہے ہیں جو اسلامی تعلیمات۔ اپنی اقدار اور ثقافت کی روشنی میں مصنوعی ذہانت کا تجربہ کر رہے ہیں۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر حسن شاہد ہمیں اپنی تحریر سے نوازا ہے۔ فروری میں ہمارا رابطہ نہ ہو سکا۔ اب ان کی انتہائی اہم تحریر ’اسلامی تعلیمات اور مصنوعی ذہانت‘ مختصر ہے۔ مگر بہت جامع۔ اس نئی تکنیک اور آلات کے بارے میں بنیادی تحقیق۔ نئی نسل کو چاہئے کہ وہ خاص طور پر ایسی تحریریں غور سے پڑھیں۔ اپنے حلقے میں اسے عام کریں۔ اس پر Chat کریں۔ پھر ’اطراف‘ کو بھی اس میں شامل کریں۔“

مغرب شدت سے سچ کی تلاش میں جو صرف اسلام فراہم کر سکتا ہے

تحریر: ڈاکٹر حسن شاہد، راولپنڈی

گزشتہ سال، انہی دنوں میں، اقوام متحدہ کی جانب سے پہلی مرتبہ اسلاموفوبیا کے خلاف عالمی دن منایا گیا، جو بائیں اور دائیں بازو کے خیالات رکھنے والوں کو ایک جگہ اور ایک شوق وسوچ پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی ایک بڑی کوشش تھی اور جسے سراہا جانا چاہیئے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب بھی کئی مغربی ممالک میں ایسے گروپس اور سیاسی پارٹیاں نظر آتی ہیں جن کے ایجنڈے میں مسلمانوں سے نفرت پوری طرح شامل ہے۔

فریڈم پارٹی نیدرلینڈز کی دائیں بازو کی ایسی ہی ایک جماعت ہے۔ اس جماعت کے ایک اسلام مخالف، سرگرم رکن یورم وان کلیورن Joram van Klaveren نے چند سال قبل اپنے نظریات تبدیل کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

وی او اے یعنی امریکی نشریاتی ادارے کے ساتھ ان کی گفتگو اگر آپ سنیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مغرب شدت سے "سچ" کی تلاش کر رہا ہے اور صرف اسلام ہی یہ سچ فراہم کرنے کی طاقت رکھتا ہے

Artificial Intelligence

پر کامیاب کوششوں کے نتیجے میں ہم ان شا اللہ اسلام کی تعلیمات غیر مسلم آبادی کو بہت زیادہ عمدہ انداز میں پڑھا اور سمجھا سکتے ہیں۔

کمپیوٹر سے متعلق جدید معلومات کو اردو میں، اس میگزین کے ذریعے، قرار واقعی طرح سے اپنے قارئین تک پہنچانا اسی سلسلے کی ہماری ایک کوشش ہے جسے ہم آپ کے لئے انٹرنیٹ ایکسپلورر کی مدد سے پہنچانے کی سعی کر رہے ہیں

براہِ کرم قرآن پاک کی اس خوبصورت آیت کو اچھی طرح سے مکمل دریافت کریں، تفصیل سے پڑھیں اور اس کی گہرائی میں جائیں!

وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

یہ آیت قرآن مجید میں تین مرتبہ آئی ہے:

1.سورہ توبہ (33:9): یہ آیت اس حوالے کا حصہ ہے جو دوسرے مذاہب پر اسلام کی برتری پر زور دیتی ہے۔

2.سورہ فتح (28:48): اس تناظر میں، یہ آیت اسلام کو پھیلانے اور اسے دوسرے عقائد پر غالب کرنے کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو اجاگر کرتی ہے۔

3.سورہ الصّف (9:61): یہاں یہ آیت اس حوالے کا حصہ ہے جو مومنوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے اور اسلام کو دوسرے تمام مذاہب پر غالب کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

ہر ایک مثال میں، یہ آیت اسلام کی حتمی فتح اور اللہ کے پیغام کی سچائی کو واضح کرتی ہے۔ اور عملی طور پر کچھ کرنے پر زور دیتی ہے

گزشتہ ہفتے، بل گیٹس کا بیان، کہ اہم تین پوزیشنوں کے سوا، عوام کمپیوٹر پر مبنی انٹیلی جنس سے ہونے والی پریشانیوں کو برداشت کریں گے، اور نوکریوں کا خاتمہ ہو جانا سو فیصد درست نہیں ہے، کیونکہ میں اس کے اس محتاط اظہار کی پیشکش کا کوئی ثبوت انٹرنیٹ پر تلاش کرنے سے قاصر رہا تھا۔ بہر حال، universities نے اس بارے میں واضح بات کی ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی ذہانت کا مختلف اداروں اور پیشوں پر واقعی کیا اثر پڑے گا۔ اشارہ کیا گیا ہے، کہ مصنوعی ذہانت بنیادی طور پر ایسے کاموں پر اثر انداز ہو گی جن میں معمول کے اور بار بار ہونے والے کام شامل ہیں، مثال کے طور پر ایک ہی طرح کی معلومات کا بار بار گزارنا، کلائنٹ سپورٹ، یا بک کیپنگ، اور انٹرنیٹ اکاؤنٹنگ ۔ پھر، وہ پیشے جن میں اختراعی، تنقیدی سوچ، اور انسانی رفاقت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کمپیوٹرائزڈ ہونے کی طرف کم مائل ہوں گے۔ ماہرین نے اس ذہانت سے چلنے والی معیشت کے لیے مزدوروں کی مناسب منصوبہ بندی اور تربیت وٹریننگ کئے جانے اور دوبارہ مہارت پیدا کرتے جانے کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

وہ قبول کرتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت نوکرنیوں کے بہت سے نئے دروازے بھی کھولے گی، تاہم مزدوروں کو اہم رہنے اور اپنی ضرورت برقرار رکھنے کے لئے ایڈجسٹ کرتے رہنا اور مسلسل نئ صلاحیتیں حاصل کرتے رہنا چاہیئے ہوگا۔

ان عہدوں کا ایک حصہ جو مصنوعی ذہانت سے چلنے والی معیشت میں ممکنہ طور پر بنا، یا پنپنے والا ہے، اس میں شامل ہیں۔ اختراعی پیشے: کاریگر، اسکالر، تخلیق کار اور فنکار، انسانی اختراعی اور تخلیقی صلاحیتوں پر انحصار کرتے رہیں گے۔۔

طبی نگہداشت اور سماجی خدمات: ایسے پیشے جن کے لیے ہمدردی، انسانی تعلق، اور پیچیدہ نیویگیشن کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے کہ ماہرین، حاضرین، اور سماجی مزدور، تلاش کئے جائیں گے۔۔

ٹیلنٹڈ ایکسچینجز اور کرافٹس: برقی ماہرین، ہینڈ مین، لکڑی کے کام کرنے والے، اور دیگر ہونہار ڈیلرز سے توقع کی جاتی رہے گی کہ وہ حقیقی بنیاد کو برقرار رکھیں گے اور درست کرتے رہیں گے۔

اگرچہ کمپیوٹر پر مبنی ذہانت بلاشبہ مختلف کاروباری اداروں اور پیشوں کو پریشانی میں مبتلا کرے گی، لیکن یہ ناممکن ہے کہ یہ اہم تجزیاتی تین پوزیشنیں AI کو مل جائیں۔

ٹموتھی جان ونٹر، Timothy John Winter جسے اسلامی نام اختیار کرنے کے بعد عبد الحکیم مراد کہا جاتا ہے، ایک انگریز دانشور، عالم اور اسلامی محقق ہے جو اسلامی قدامت پسندی کا جدید محافظ بھی ہے۔ اس کا تمام کام اسلامی فلسفہ، ترقی، اور کسی حد تک انگریز۔ مسلم تعلقات کے لئے کیا گیا ہے، اور اس نے چند اسلامی متن کی تشریح بھی کی ہے۔ Joram van Klaveren۔ سابق ڈچ قانون ساز جنہوں نے ہالینڈ سے مساجد اور تمام اسلامی طریقوں کا بائیکاٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ایک کتاب لکھنے کی کوشش کرنے کے بعد، سچ کی تلاش، research اور ٹموتھی ونٹر کے ساتھ گفتگو، نے یقینی طور پر اس کے نقطہ نظر کو تبدیل کر دیا، اور وہ مکمل طور پر اسلام میں تبدیل ہو گیا۔

اس لیے اسلام کی صحیح تفہیم پر توجہ دینے اور اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت، ہم سب کی ضرورت ہے۔ اور دور جدید میں زندہ رہنے کے لئے ہمیں اسلام کی تعلیمات کے لئے مخلصانہ کوشش بھی کرنی ہوگی۔ ❁

کلچر ہمیں راستہ دکھاتا ہے

آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی ہر سال ایک عالمی اردو کانفرنس منعقد کرتا ہے۔اس سال سترہویں عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس کو 'جشنِ کراچی' کا نام دیا گیا۔چار روزہ اس کانفرنس کے تمام اجلاسوں کا مرکزی حوالہ کراچی تھا۔ان اجلاسوں میں ادب کی جملہ اصناف۔تنقید، فکشن، غزل، نظم وغیرہ زیرِ بحث آئیں اور تقدیسی ادب اور بچوں کا ادب بھی موضوعِ گفتگو بنا۔دیگر اجلاسوں میں فنونِ لطیفہ، ماضی کے کراچی کی یادیں، کراچی کا آرکیٹکچر، تعلیم اور تعلیمی ادارے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، نظمِ حکمرانی، شہری منصوبہ بندی اور دیگر موضوعات زیرِ بحث آئے۔۵ سے ۸ دسمبر تک جاری رہنے والی اس عالمی اردو کانفرنس کا اختتامی اجلاس وائی ایم سی اے کے میدان میں منعقد ہوا جس کی صدارت گورنر سندھ جناب کامران ٹیسوری نے کی۔اس اختتامی اجلاس میں کلیدی خطبہ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے دیا جس کا موضوع انہوں نے "کلچر ہمیں راستہ دکھاتا ہے" رکھا تھا۔ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ یہاں 'اطراف' کے قارئین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

ہم جشنِ کراچی کیوں منا رہے ہیں؟

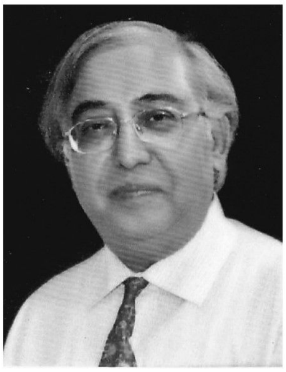

تحریر: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

محترم گورنر صاحب، صوبہ سندھ، غیر ملکی سفارتی عمائدین، بیرونِ ملک اور ملک بھر سے آئے ہوئے محترم مندوبین، آرٹس کونسل کے صدر جناب احمد شاہ صاحب، اراکین گورننگ باڈی، خواتین، حضرات اور غیر معمولی تعداد میں موجود طلبہ و طالبات۔

پچھلے چار روز ہم نے اپنی ثقافت میں رچ بس کر گذارے ہیں۔انفرادی سطح پر ہمارا اپنا جو بھی ثقافتی اثاثہ تھا، یا جو کچھ بھی ہم نے انفرادی طور پر اپنی ثقافت کے حوالے سے سمیٹا اور سمجھا تھا، آج چار روز بعد ہم خود کو اس حوالے سے زیادہ ثروت مند سمجھتے ہیں۔

اس اردو کانفرنس کے چونسٹھ (۶۴) اجلاسوں میں پاکستانی کلچر اور خاص طور سے کراچی کے ثقافتی کوائف کا بھرپور احاطہ ہوا۔

اس کانفرنس کو 'جشنِ کراچی' کا نام دیا گیا۔

جشنِ کراچی میں کلچر کی کس کس جہت کو زیرِ بحث لایا گیا، ان سب جہتوں کے عنوان گنوانا بھی مشکل ہے۔

ادب کی مختلف اصناف تنقید، فکشن، فکشن میں افسانہ اور ناول، شاعری اور شاعری میں غزل، نظم، مرثیہ، تقدیسی ادب، بچوں کا ادب، مختلف زبانوں کی تخلیقات کا جائزہ، اردو کے علاوہ سندھی، بلوچی، سرائیکی، پشتو، اور پنجابی، ان سب کا ذکر اس کانفرنس میں کیا گیا۔

جشن میں مصوری کی بات ہوئی، موسیقی کا جائزہ لیا گیا، موسیقی سُنی گئی، رقص موضوعِ گفتگو بنا، تھیٹر، ریڈیو، اور ٹی وی کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالی گئی، میڈیا کی تاریخ میں جھانک کر دیکھا گیا۔

بیرونِ ملک آباد پاکستانیوں کی تعمیر کردہ اردو کی نئی بستیاں زیرِ بحث آئیں۔ان بستیوں کے مکینوں کی تخلیقی سرگرمیاں، خود وہاں سے آئے ہوئے مہمانوں کی زبانی سُنی گئیں۔جشن میں ہم نے کراچی اور ملک کی معیشت کے خدوخال سمجھے، تعلیم کے شعبے کی صورت حال دیکھی، ماحولیات کے چیلنج ہمارے سامنے آئے۔شہری منصوبہ بندی اور آبادی کے پھیلاؤ پر بات ہوئی، کتابوں کی رونمائیاں ہوئیں اور بڑی تعداد میں یونیورسٹیوں کے طالبعلموں اور دیگر نوجوانوں کو جشن میں شریک کیا گیا۔

اتنا بھرپور احاطہ یہ رہا، ثقافت کے ہر رنگ نے، کلچر کے ہر پہلو نے ہمارے مشامِ جاں کو معطر کیے رکھا۔

شاید اب یہ مناسب وقت ہے کہ ہم دو ایک سوالوں کے بارے میں سوچیں۔

پہلا سوال تو یہی ہے کہ اس جشن کا مقصد کیا تھا؟

میرا خیال ہے کہ یہ سوال یوں اہم ہے کہ کراچی کے اور بھی چہرے ہیں، مسخ شدہ چہرہ، یبوست زدہ چہرہ، مضمحل چہرہ، اور ان چہروں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی حکومتوں کی ناکامیاں، سہولت کاروں کی کارگذاریاں، انتہا پسندوں کی دست درازیاں، مافیاؤں کی دنیا، نظم حکمرانی کی شکست وریخت، شہریوں کی بے چارگی، کراچی سے ذرا اور بڑھ کر دیکھیں تو صوبوں کے درمیان فاصلے اور ان فاصلوں کے کراچی پر پڑنے والے اثرات، کراچی سمیت سب شہروں کے شہریوں کی بنیادی سہولتوں کے بارے میں بے بسی۔

تو چلیں بات یہیں سے شروع کرتے ہیں۔

نظم حکمرانی کا۔۔۔اداروں کے تصادم کا بحران

آج کے پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ریاست، معاشرے سے لاتعلق نظر آتی ہے۔

آئین اور اس کے بنائے ہوئے ادارے یا تو اپنے متعین کردہ کام کرنے کے بجائے دوسرے کاموں میں مصروف ہیں یا کچھ نہیں کر رہے۔اور اگر کچھ کر بھی رہے ہیں تو بے دلی اور بے توجہی کا ساتھ۔

نتیجہ یہ ہے کہ نظم حکمرانی کا بحران ہے، اداروں کے تصادم کا بحران ہے، وحدتوں کے درمیان ارتباط نہ ہونے کا بحران ہے، بربادی کا منظر نامہ ہے، کرپشن کا زہر اداروں کے رگ وپے میں سرائیت کر چکا ہے، شہری بیچارگی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ان کی چارہ گری ریاستی اداروں سے نہیں ہوتی تو وہ بیچ والوں، ٹھیکیداروں اور مافیاؤں کے ذریعے اپنے کام کروانے پر مجبور ہوتے ہیں۔اس وقت جو میں یہ لائنیں لکھ رہا ہوں، میرے گھر میں چھ دن سے پانی نہیں آیا، کل ہم نے بھی مافیا کا سہارا لیا، ساڑھے نو ہزار کا ٹینکر ڈلوایا۔یہ کراچی کے شاید ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے۔سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں، اسٹریٹ کرائمز روز کا معمول ہیں۔

ملک کے دوسرے شہروں کی طرح کراچی میں بھی بحیثیت مجموعی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں غیر معمولی جرأت مندی کے بغیر اور آزادانہ طور پر منعقد کرنا خاصا مشکل کام ہے۔شہر کے سینما گھر ختم ہو رہے ہیں، ان کی جگہ شاپنگ مال بنائے جا رہے ہیں۔کتابوں کی دوکانیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں، اردو بازار میں کتابوں کی دکانیں تیزی سے اسٹیشنری کی دوکانوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

کلچر ہمیں راستہ دکھاتا ہے

تو پھر ہم یہ جشنِ کراچی کیوں منا رہے ہیں؟
ہم نے یہ دیکھنا اور دکھانا چاہا ہے کہ یہ شہر ماضی میں کیا تھا اور مستقبل میں اس کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں؟

شہر، کراچی کا ہو یا دنیا کی کسی اور ملک کا ، جنت تو کبھی کوئی شہر نہیں بنا مگر بہت سی خوبیوں، بہت سی کامرانیوں کے حامل شہر ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ دنیا میں بیسیوں ایسے شہر آج بھی موجود ہیں جہاں کے شہری اپنے شہروں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ شہر سے دور آباد ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اُن کی مادی ضرورتیں اگر شہر میں مکمل طور پر پوری نہ بھی ہو رہی ہوں مگر ذہنی آسودگی اُن کو شہر کے ساتھ جوڑ کر رکھتی ہے۔ ایک عام آدمی شاید شہر کے ساتھ اپنے قریبی تعلق کا زبانی طور پر اظہار نہ کر سکتا ہو مگر لکھنے والے ادیب اور شاعر، اپنے جذبات کو

آرٹس کونسل نے ثقافت اور تہذیب کو معاشرہ سازی کا وسیلہ بنایا

کھل کر لکھ دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ اگر شہر ان کے خمیر میں گندھ جاتا ہے تو اس کا اظہار بھی خوب ہوتا ہے۔ حبیب جالبؔ ہمارے بڑے ہر دلعزیز عوامی شاعر تھے۔ ایک زمانے میں انہوں نے کہا تھا ؎

آج اس شہر میں ،کل کسی شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

مگر اسی شوقِ آوارگی نے جب اُن کو لاہور پہنچا دیا، تو پھر یہ شہر اُن کا جذباتی مسکن بن گیا۔ حیدر آباد جیل میں انہوں نے کہا ؎

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں
بیتے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں
محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں
لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں

کراچی کا ماضی بہت خوشگوار یادوں کا ماضی بھی ہے۔ کتنی خوبصورت شاعری صرف اس شہر کی تحسین میں ہوئی ہے۔ سہولتیں ماضی میں بھی کوئی بہت ارزاں نہیں تھیں مگر امید تھی اور امید بہت کچھ ہمت پیدا کرتی تھی۔ شہر میں زندگی گزارنا اچھا لگتا تھا۔ زندگی وبالِ جان نہیں بنی تھی۔ لوگ فرار کے راستے ہی کو بقا کا راستہ نہیں سمجھتے تھے۔ کھانستے ہوئے بوڑھے باپ لڑکوں سے یہ تو نہیں کہتے پائے جاتے تھے کہ بیٹا یہاں کچھ نہیں رکھا، باہر نکل لو۔ ۲۰۲۲ء میں ۱۵ لاکھ پاکستانی بیرون ملک گئے۔ ۲۰۲۳ء میں یہ تعداد ۱۶ لاکھ ہو چکی تھی۔ یہ اقوام متحدہ کے پاپولیشن ڈویژن کے اعداد و شمار ہیں۔
سو، سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟

ہم شہریوں کے نقطۂ نظر سے بات کرتے ہیں۔ ملک کو ایک معمول کا معاشرہ بنانے کے لیے سیاسی و انتظامی فیصلے تو ناگزیر ہیں لیکن کلچر اور ثقافت کے حوالے سے بھی جو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ کلچر ہی شہریوں کا سب سے بڑا اور اہم ہتھیار ہے۔ آپ اسے ہتھیار نہ کہیں ، ایک راہ کشا چیز کہہ لیں، زندگی کو ہموار بنانے کا وسیلہ کہہ لیں۔ ہماری تخلیقات ، ہمارا ادب، ہماری زبانیں ، ہمارے فنونِ لطیفہ ، یہ سب ہمیں جوڑنے کا ذریعہ بنتے چلے آئے ہیں ۔ یہ ہی ہمارے لیے راستے کھولیں گے۔ ہمارے ادب کا غالب حصہ انسان دوستی کا پیغام دیتا ہے۔ ملک کی سب زبانیں ایک دوسرے سے بہت کچھ اخذ کرکے، بہت کچھ لے کر پروان چڑھتی ہیں ، ہمارا فوک لٹریچر، ہماری موسیقی، ہماری مصوری ،ان سب میں قبولیت کا غیر معمولی رجحان پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہماری سینکڑوں تخلیقات نے مختلف تہذیبی دھاروں کو خود میں آمیز کر کے اپنی پہچان بنائی ہے۔ کراچی میں جو کاسموپولیٹن کلچر وجود میں آیا ہے اور روز بہ روز اس میں بڑھاوا آ رہا ہے وہ اس بات کا عملی مظہر ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیتے ہیں تو باوجود ان ریشہ دوانیوں کے جو اُن کو تقسیم کرنے کے لیے کی جاتی ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی فطرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تہذیبی سرگرمیاں اُن کو اختلاط کے مؤثر مواقع فراہم کر دیتی ہیں۔ بہت سی فالٹ لائنز کو کلچر ہی کے ذریعے سے غیر مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔ آرٹس کونسل کے پچھلے چند برسوں کے تجربات بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ آرٹس کونسل نے گذشتہ برسوں میں عالمی اردو کانفرنس کے علاوہ پاکستان لٹریچر فیسٹول، عالمی کلچر فیسٹول ،نوجوانوں اور بچوں کے فیسٹول ،موسیقی اور رقص کے مختلف پروگرام، کتابوں کی تقاریبِ اجراء، یہ اور ایسے ہی جو سینکڑوں پروگرام کیے ہیں، اُن میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ آتے رہے۔ نوجوانوں میں جو جوش و خروش ہوتا

کلچر ہی شہریوں کا سب سے بڑا اور اہم ہتھیار

ہے، اور پھر ان پروگراموں کے حوالے سے ہفتوں سوشل میڈیا پر جو تبصرہ آرائی ہوتی ہے، یہ سب کچھ مایوسی کی عموعی ملکی فضا میں حوصلہ افزائی کے قابلِ غور سگنلز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آرٹس کونسل نے ایک ایسے شہر میں جہاں ایک ایک دن میں سو سو لاشیں اٹھتی تھیں، محلّوں میں سرحدیں کھینچ دی گئی تھیں۔ لوگ نسلوں کے حوالے سے تقسیم کر دیے گئے تھے۔ تعلیمی ادارے ہفتوں بند رہتے تھے، اس شہر میں ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعے سے خوف کی فضا کو شکست دے کر لوگوں کو خود اعتمادی فراہم کی ۔ اس سے یہ بھی ثبوت ملا کہ لوگ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں، گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ہنر اور تخلیقات سے دوسروں کو واقف کروانا چاہتے ہیں۔ زندگی ان کو اچھی لگتی ہے اور وہ اس کو اور اچھا بنانا چاہتے ہیں ۔ لوگوں نے دیکھا اور آرٹس کونسل نے اس کا اہتمام کیا کہ ثقافت کو اور تہذیب کو معاشرہ سازی کا وسیلہ بننا چاہیے۔ اس کانفرنس نے بھی یہی پیغام دیا ہے ،اور مجھے یقین ہے آپ سب بھی اس کی توثیق کریں گے کہ کلچر ہمیں راستہ دکھا سکتا ہے، کلچر ہمیں راستہ دکھا رہا ہے۔ ✻

مہناز حسن کی یادداشتیں اب عملی زندگی میں داخل ہو رہی ہیں۔ بہنوں کی شادیاں۔ بھانجے بھانجیوں کی پرورش کے بعد اب کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ سیاست کا دور شروع ہو رہا ہے۔ یہ یادداشتیں اپنے اپنے دور کی ثقافتی اقدار۔ روایات اور تمدن کو اُجاگر کرتی ہیں۔ کتنے پُر امن ادوار تھے۔ خواتین کا احترام

موبائل کی لت نہیں تھی۔ رشتے جڑے ہوئے تھے

تحریر: مہناز حسن، سابق ڈائریکٹر محکمۂ اطلاعات

میرے اندر ایک اتھل پتھل ہوتی تھی۔ بہت سارے آئیڈیاز میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے جنھیں میں لکھنا چاہتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے میرے دماغ میں مختلف سوالات کی بارش برسنے لگتی کہ لکھ بھی لیا تو یہ چھپیں گے کیسے۔ مجھے اخبارات کے دفاتر کا بھی پتہ نہیں۔ نہ وہاں کے لوگوں سے میری شناسائی ہے۔ میری تحریریں چھپنے کے مراحل کیسے طے کریں گی۔ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب لاحاصل تھے۔

1972 میں جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو طویل چھٹیاں گویا میرے لیے عذاب سے کم نہ تھیں۔ ایسے میں اللہ بھلا کرے ہماری مرحومہ والدہ کا جب امتحان سر پر ہوتے تھے کڑاکے کی سردیوں میں (اس وقت واقعی سردیاں بہت ہوتی تھیں) رات 4 بجے ہمیں جگا دیتیں کہ اٹھ کر پڑھو کیونکہ اس وقت جو کچھ پڑھو گی کبھی بھول نہیں پاؤ گی اور ہم بہن بھائی جن کے درمیان دو تین سالوں ہی کا فرق ہوگا لحافوں میں دبکے اپنے اپنے حساب سے اپنے امتحانوں کی تیاریوں میں مصروف ہوجاتے۔ لیکن جیسے ہی امتحان ختم ہوجاتے مرحومہ اماں کی طرف سے اتنی ڈھیل ضرور مل جاتی کہ زیادہ سے زیادہ صبح 8 بجے تک سوجاؤ اور اس کے بعد گھر کا کام کاج سنبھالو۔ امتحانوں کے دنوں میں کسی کام کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ ہوتی اور امتحانوں کے بعد لمبی تان کے سونے کی اجازت نہ ہونے کے بعد سلائی، کڑھائی اور بُنائی کی کلاسیں شروع ہوجاتی تھیں ظاہر ہے اس وقت تک موبائل، وی سی آر وغیرہ کی لت تو پڑی نہ تھی اور ہمارا سماج انسانی رشتوں و روابط کی کڑیوں میں جڑا ہوتا تھا۔

میٹرک میں میری سب سے بڑی بہن کی شادی ہوئی اس وقت جملہ تیاریوں میں برابر کی شریک تھی حالانکہ عمر صرف 15 برس تھی اور اس کے بعد آپا کی شادی کے سلسلے بڑے دور تک جا رہے تھے آپا کے ہاں ہر سال ایک فرد کا اضافہ ہو رہا تھا۔ آپا کی ساس ضعیف تھیں ان کی کوئی نند بھی نہیں تھی لامحالہ ہماری اماں ان کی دیکھ بھال کرتیں اور میں اور میری دوسری بہن آپا کے بچوں کو سنبھالتے۔ وہ بھانجے

میری ماں کہا کرتی تھی اپنے توشے اپنے بھروسے

بھانجیاں خوش نصیب ہوتی ہیں جنکے بچپن ان کی خالاؤں کی گود میں گزرتے ہیں۔ یہی خالائیں اگر شادی شدہ ہوجاتیں تو بس بہن کی اولادوں کو دور دور ہی کا پیار مل سکتا ہے۔ آج بھی ان بچوں کی محبت پہلے دن کی طرح ہمارے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے پیدا کرنے والی سے پالنے والی کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ ہم نے ان کے تمام بچوں کو پالا ہے۔ آپا کو خبر بھی نہیں ہوتی کب کس نے کیا کھایا کیا پیا کب سوئے کب جاگے۔ کپڑے کہاں سے آئے کس نے سِئے عید کی خریداری کس نے کی کس نے بال کٹوائے۔ آپا ساس سسر کے ساتھ ہی رہتی تھیں وہ بھی مطمئن تھے کہ ان کے زیادہ تر مسائل میکے والے حل کر دیتے تھے۔ آپا کے ہاں ماشاء اللہ چھ بیٹیاں اور چار بیٹے پیدا ہوئے۔ ظاہر ہے ان کی ساس اتنی ضعیف تھیں اور اتنے چھوٹے چھوٹے بچے۔ ان کی نگرانی آخر کون کرتا جبکہ ہر سال ایک اضافہ ہو رہا تھا آپا دو مہینے ہمارے گھر ہی گزارتی اور دو مہینوں میں وہ مکمل آرام کرتیں۔ اللہ مغفرت کرے

اب جبکہ زندگی کے مختلف مدارج اپنا اپنا دور گزار چکے ہیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آرہی ہے کہ ہماری ماں نے نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت کے اٹل اصولوں پر کس سختی سے عملدرآمد کروایا ہمیں مستقبل کی زندگی کے لیے کس طرح تیاری کروائی کہ گھر سے لے کر باہر تک نہ کسی کی محتاجی تھی نہ کسی سہارے کی ضرورت۔ ہر قدم پر ان کا دیا ہوا اعتماد ہی ہمارا بہترین ہم سفر تھا۔ ان کا کہا ہوا ایک جملہ جو وہ اکثر ہم سے کہا کرتی تھیں ”اپنے توشے اپنے بھروسے“ ہمیں آگے سے آگے بڑھنے میں مہمیز ثابت

بہو افسر ہے۔ گھر کا کام اس کے بس کی بات نہیں

ہو رہا تھا۔ سسرال میں کبھی کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ تمہاری ماں نے تمہاری کیسی تربیت کی ہے۔ بلکہ میری مرحومہ ساس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ ان کی بہو افسر ہے گھر کے کام کاج کھانا پکانا وغیرہ اس کے بس کی بات نہیں لیکن یہ ان کی ناقص سوچ ثابت ہوئی وہ خوش تھیں کہ چلو بھئی ایسا نہیں ہے۔

میرے بہنوئی نصرت بھائی جب تک زندہ رہے ہمارے شکرگزار رہے ہمیں اپنی بہنوں کی طرح چاہتے تھے۔ ہر عید بقرعید ہمیں زبردستی اپنے گھر بلاتے ہماری پلیٹوں میں اپنے ہاتھ سے کھانا ڈالتے اور عیدی ضرور دیتے۔ بہت سے بچوں کی پیدائش کے دوران ہمارے امتحانات کا سلسلہ بھی رہا لیکن اس کے باوجود بچوں کی دیکھ بھال میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ نصرت بھائی جنہیں ہم دولہا بھائی کہتے تھے ہفتہ دس دن بعد ہمارے گھر آتے حالات کا جائزہ لیتے۔ بچوں سے ملتے بچوں کے حلیے حال احوال سے اندازہ لگالیتے سب

پورا گھر بڑے بھائی سے تھرتھر کانپتا تھا

کچھ ٹھیک چل رہا ہے داماد کے مزے لیتے اور خوش خوشی واپس اپنے گھر چلے جاتے۔ وہ اپنے بچوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہوکر اپنے دفتری امور کی بہترین انجام دہی کررہے تھے۔ دو مہینے گزار کر آپا واپس اپنے گھر چلی جاتیں اور اب وہاں جو کچھ بچوں کے مسئلے مسائل تھے اس کے لیے ہر دوسرے تیسرے دن ہمیں ان کے گھر کی دوڑ لگانی پڑتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں پبلک ٹرانسپورٹ ہوا کرتی تھی اس لیے ہمیں آپا کے گھر جانا نسبتاً آسان تھا۔

کبھی خبر آتی فلاں بچہ گر گیا ہے۔ فلاں بچے کے حلق میں بٹن پھنس گیا ہے۔ فلاں کا سر پھٹ گیا ہے۔ دولھا بھائی تو اپنی دفتری مصروفیات کو روز روز چھوڑ کر آنے سے رہے لامحالہ یہ سارے ایمرجنسی کام ہم بہنوں ہی کو انجام دینے ہوتے تھے۔

ان تمام کا مطلب یہ تھا کہ آپا کی اولادیں ہماری گودوں میں پلتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب بچے ہم لوگوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ آپا کی پہلی اولاد جس کا نام میں نے 'حنا' رکھا میری بڑی لاڈلی تھی جبکہ دوسری بیٹی کا نام ہم نے 'ارم' رکھا یہ میری دوسری بہن ناہید کی چہیتی تھی۔ ظاہر ہے جب ہم ان کے گھر پر نہ ہوتے تو وہ سب ہمارے لیے روتے تھے ضد ہوتی اماں یعنی نانی کے گھر جائیں گے آنٹی کے پاس جائیں گے اور آپا مجبور ہوتیں اور ڈانٹ ڈپٹ کرکے ان کو خاموش کردیا جاتا۔ وہ کہتی آنٹی کے امتحان ہورہے ہیں ان کو پڑھنا ہے بعد میں جب امتحان ختم ہوجائیں تو چلی جانا۔

بھانجے بھانجیاں خوش نصیب جن کا بچپن خالاؤں کی گود میں گزرتا ہے

وقت کا کام تو گزرنا ہے سو وہ پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ کس بچے کو کس اسکول میں کس کالج میں داخل کرنا ہے یہ سارے کام ہم نے بخوبی انجام دیے۔ بچے اب شعور کی منزل میں داخل ہورہے تھے۔ بچیاں کالج کا مرحلہ طے کرکے یونیورسٹی میں قدم رکھنے کو پر تول رہی تھیں ہم

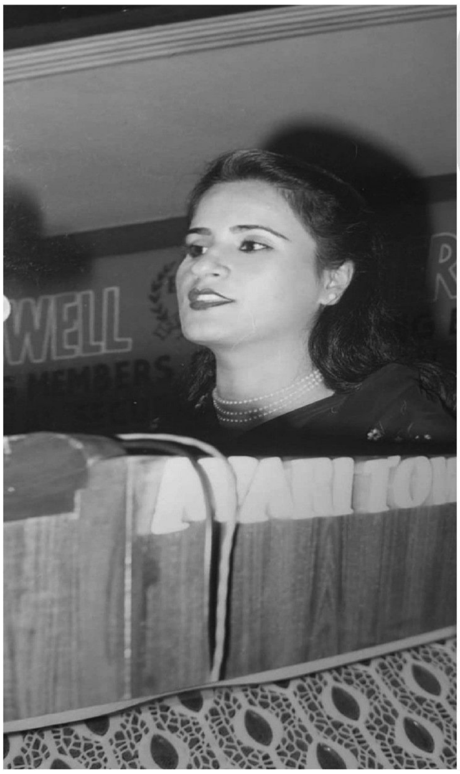

یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرچکے تھے لہٰذا یونیورسٹی میں داخلہ کا مرحلہ بھی ہماری انگلی پکڑ کر طے کرلیا گیا۔

کراچی یونیورسٹی کا شعبۂ سیاست

مادرِ علمی جامعہ کراچی جو اس وقت شہر سے کوسوں دور تھی یہ 1978 کا زمانہ تھا تب یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا یہ وہ زمانہ ہے جب خود فیصلہ سازی کی ہمت کم از کم مجھ میں بہت کم تھی لیکن صرف اخباروں میں اپنی تحریریں بھیجنے کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سمجھ میں بس اتنا آ گیا تھا کہ صحافت میں پڑھ لکھ کر میں ایک بڑی لکھاری بن سکتی ہوں

کسی کے مشورے کے بغیر شعبۂ صحافت میں داخلے کا فیصلہ کیا

مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ شعبۂ صحافت میں جانے کے بعد میرے وہ تمام مسائل جو ماموں جان کے دور جانے کے بعد میرے لیے گھمبیر صورت حال اختیار کرچکے تھے۔ سب حل ہوجائیں گے۔ میں نے بغیر کسی سے مشورے کے شعبۂ صحافت میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔

میری کلاسیں شروع ہوچکی تھیں تب ہی ایک دن ماموں جان کا فون آیا جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میرا داخلہ شعبۂ صحافت میں ہوچکا ہے تو انہوں نے کوئی خاص ردّعمل کا اظہار نہیں کیا البتہ اتنا ضرور کہا کہ صحافت میں خواتین کے لیے کوئی اسکوپ نہیں ہے حالانکہ اس وقت بھی صرف کراچی میں ہی کتنی نامور صحافی خواتین مختلف اخباروں میں اپنی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ اللہ مغفرت کرے مرحوم استاد متین الرحمن مرتضیٰ کی۔ بذلہ سنجی کے ساتھ پدرانہ شفقت اپنے طالب علموں کے ساتھ دوستوں جیسا رویہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ محترم ذکریا ساجد صاحب۔ مرحوم سر سعید احمد یا انعام الرحمن صاحب کوئی بھی کسی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مرحوم متین الرحمن مرتضیٰ کی ایک خاص بات جو میں نے بارہا محسوس کی۔ وہ ہماری بڑی سے بڑی غلطیوں پر خود بھی ہنستے اور سب کو ہنساتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے کسی سوال کے جواب میں فاش غلطی کی بس پھر کیا تھا انہوں نے کلاس ختم ہونے کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تو میں حیران ہوکر رہ گئی پوری کلاس میں مجھے ہی کیوں طلب کیا گیا ہے۔ یا اللہ خیر کرنا ایسا کیا ہوگیا ہے خیر اپنی دوستوں کے ہمراہ ان کے کمرے تک پہنچی تو میری دوستیں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے ان کی بے چینی دیکھتے ہوئے استاد محترم نے انہیں بھی اندر بلوالیا اور میرے سامنے میرا تحریر شدہ جواب رکھ دیا۔ ''یہ کیا لکھا ہے آپ نے۔'' میں نے بغور دیکھا تو لفظ ماشاء اللہ پر سرخ دائرہ نظر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس پر دائرہ کیوں بنا ہے۔ میری خاموشی بتارہی تھی کہ اس وقت تک میری غلطی مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ استاد محترم نے اب انگریزی میں Martial Law لکھا اور کہا یہ کیا ہے میں نے پڑھ کر

متین مرتضیٰ۔ ذکریا ساجد۔ انعام الرحمن۔ سب یاد آتے ہیں

سنادیا۔ کہاں اب اس کو اُردو میں لکھو تب دماغ کی پرتوں میں کچھ ہلن جلن سی ہونے لگے ''اوہ آئی ایم سوری'' سرخ دائرہ کا مطلب سمجھ میں آ گیا میں نے مارشل لاء کو ماشاء اللہ جو لکھا تھا۔ اس وقت نہ صرف وہ ہنس رہے تھے بلکہ کمرے میں موجود میری دوستیں ہنس ہنس کے پاگل ہو رہی تھیں۔

یونیورسٹی کا زمانہ اپنے اندر بڑے تلخ و شیریں واقعات سمیٹے ہوئے ہے یونیورسٹی آنا جانا اتنا آسان نہ تھا۔ کہاں ناظم آباد اور کہاں جامعہ کراچی۔ اگر پوائنٹ مس ہوجاتا تو دو بسوں کا سفر کر کے مادرِ علمی تک پہنچنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا تھا۔ دیر سویر ہوجاتی تو والدہ تو چڑھائی کرتی ہی رہتی تھیں لیکن میری زندگی کا سب سے سفاک کردار میرے سب سے بڑے بھائی کو تو بس کوئی نہ کوئی بہانہ ملنا چاہئے تھا ان کی آنکھیں، لب و لہجہ اور زہریلے الفاظ ہر روز مجھے لہولہان کر دیتے تھے۔ ابا تو اپنی ملازمت میں مصروف تھے اور رات کو ان کی واپسی ہوتی تھی انہیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ بھائی صاحب ہمیں یونیورسٹے جانے کی کس کس طرح سزا دیتے ہیں۔ پورا گھر ان سے تھر تھر کانپتا تھا وہ حقیقی بھائی سے زیادہ سوتیلے بھائی کا کردار بخوبی ادا کر رہے تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کا ان سے بڑا ذہنی فاصلہ تھا۔ وہ چاہتے تھے ہم یونیورسٹی نہ جائیں لیکن والدین کو کوئی اعتراض نہ تھا تو وہ کون ہوتے تھے ہماری راہ میں روڑے اٹکانے والے۔

میری طبیعت میں ہمیشہ سے بغاوت کے جراثیم کلبلاتے رہتے تھے۔ حق اور سچ کی تو اپنی ہی طاقت ہوتی ہے جو آپ کو بے تیغ بھی لڑنے کی ہمت عطا کر دیتی ہے۔ بھائی صاحب کے رویے میں دن بدن مزید سختی سرایت کرتی جا رہی تھی اور اب تو اماں بھی بے بس نظر آنے لگی تھیں بات ابا تک پہنچتی تو ظاہر ہے باپ بیٹے میں تلخی پیدا ہونا فطری تقاضا تھا سو یہ سب ابا تک پہنچ نہیں پا رہا تھا روز روز کی جھک جھک سے میرا دماغ پکنے لگا تھا آخر ایک دن بھائی صاحب نے اپنا فیصلہ دے دیا کل سے یونیورسٹی جا کر دکھاؤ۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا جوش مارنے لگا۔ اس سے پہلے کبھی کسی بڑے کے سامنے میری زبان نہ کھلی تھی لیکن اس دن یہ زبان بے قابو ہوگئی اور پہلی دفعہ میں نے پورے جسم سے کانپتے ہوئے اپنی تمام تر قوتوں کو سمیٹتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں بھائی صاحب کو گوش گزار کیا کہ جب ابا کو ہماری تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں یونیورسٹی جانے پر کوئی مسئلہ نہیں تو آپ کون ہوتے ہیں ہمیں روکنے والے۔ ہم یونیورسٹی جائیں گے کرلیں جو کرنا ہے۔ اس دن پہلی دفعہ یہ حقیقت میرے سامنے آئی کہ ''جو ڈر گیا وہ مرگیا'' بھائی صاحب کا لال بھبھوکا ہوتا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ ان کی مردانہ غیرت پر غضب کا تازیانہ پڑا ہے ان کا بس چلتا تو شاید میرا گلا دبا دیتے۔ لیکن ''ہمت مرداں مدد خدا'' کے مصداق وہاں پر ایک نہ ختم ہونے والی خاموشی اپنی جگہ بنا چکی تھی۔

ہم اپنوں کے سامنے ڈٹ بھی جائیں تو اندر سے مرنے لگتے ہیں۔ میں بھی بار بار مرمر کے جی رہی تھی۔ یہ وہ ظالم لمحہ تھا جب مجھے یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ بعض اوقات آپ اتنے اکیلے

ہوجاتے ہیں کہ دنیا کا قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ ماں باپ بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں ایک رشتہ اپنے رب کا ہوتا ہے جو ہر مشکل میں آپ کا مددگار، مونس اور غمخوار ضرور ہوتا ہے جو اُمید کے دامن کو چھوٹنے نہیں دیتا۔

یونیورسٹی کی دو سالہ رفاقت نے یہ تو ثابت کر دیا کہ یہاں پر تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے نہ صرف میچیورڈ ہوتے ہیں بلکہ یہاں کی خواتین کا ادب و احترام اپنا اوّلین فرض تصور کرتے ہیں۔ جبکہ یہاں سے نکلنے کے بعد یہ مظاہرہ عام جگہوں پر ہرگز نظر نہیں آتا۔

جنوری 1980 میں میرے والد میری تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان دنوں میں گھر پر ہی ہوتی تھی ظاہر ہے گھر کا سربراہ گھر چھوڑ جائے تو اس کی خالی جگہ کون پُر کرسکتا تھا۔ والدہ کو تو جیسے خاموشی کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور ان کی اس خاموشی میں بلا کے مدّو جزر ہمیں نظر آ رہے تھے۔ تین بیٹیوں کا بوجھ اکیلے اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا ایک بھائی ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب گئے ہوئے تھے باقی دو اپنی دنیا میں مگن۔ امی کو کوئی کندھا نہیں مل رہا تھا جس پر سر رکھ کر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتیں۔

اللہ مغفرت کرے مرحوم متین الرحمن مرتضیٰ کی جب انہیں میرے والد کی خبر ملی تو اپنے اسٹوڈنٹس کے ہمراہ تعزیت کے لیے میرے گھر تشریف لائے۔ زمانہ شناس تھے آنے والے بے دردلمحوں، زمانہ کی سفاکیوں اور مطلوبہ ہمتوں کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی میرے سر پر ہاتھ رکھا تو آنکھوں سے سیل رواں جاری ہوگیا۔ ابّا کے جانے کے بعد یہ پہلا ہاتھ تھا جس نے لمحہ بھر کے لیے یہ احساس شدید ترین کر دیا کہ ایسے ہی نہیں کہتے کہ استاد بھی باپ ہوتا ہے۔ اللہ مرحوم متین صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے ان کے کہے گئے الفاظ میرے زخموں پر پھایا کے مانند تھے واقعی تعزیت وہ رحم ہے جو بڑے بڑے دکھتے دلوں کو لمحہ بھر میں یہ احساس دلا رہا ہوتا ہے کہ آپ کے دل و دماغ کو تھپک تھپک کر یہ سمجھا رہا ہوتا ہے کہ:

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کرغم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

❁❁❁

جناب اشفاق بدایونی جدہ میں مقیم ہیں مقدس سرزمین میں پاک سرزمین کےلیے دعاگو رہتے ہیں۔ یارانِ نکتہ داں کیلئے۔ایک اعلیٰ معیاری ادبی تصنیف کے خالق حسِ مزاح بلند تر وطن کیلئے فکر مند ۔اطراف کی درخواست پر ہر ماہ اظہاریہ سے نوازتے ہیں۔پڑھیئے اس ماہ کا اشفاقیہ

وَالا کی آوازیں گلیوں میں سب سے زیادہ سنائی دیں

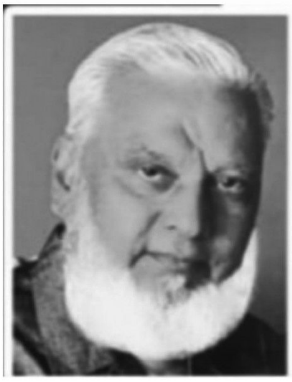

تحریر:...............اشفاق بدایونی

تین دہائیوں سے زاید کا عرصہ گزرا کہ ہم وطن کی آغوش سے دور دیارِ دگر میں مقیم ہیں ہم نے دیارِ غیر کی اصطلاح اس لیئے استعمال نہیں کہ جس دیار میں بیت اللہ ہو، روضۂ رسول ہو وہاں ایک مسلمان کے لیئے غیریت چہ معنی دارد.ہم تیس بتیس سالوں سے اپنے ملک میں چھٹیوں کے تیس دن گزارنے آتے ہیں ابتداً تو ایسا لگتا تھا کہ تیس دن ۔تیس گھنٹوں میں گزجاتے ہیں پھر یوں ہوا کہ بڑھتی ہوئی عمر اور ذمہ داریوں میں بدرجہ کمی نے گزرتے وقت کی رفتار بھی کم کردی اور پھر تیس دن ۔تیس دنوں میں ہی گزرنے

بکنے والا مال تو ہماری اسمبلوں میں بھرا ہوا ہے

لگے حالیہ سالوں میں یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے تیس دن تین ماہ کے برابر ہوگئے ہوں اس مرتبہ تیس دنوں میں ہر دن نے ماضی کے بہت سے دریچے وا کیئے بہت سی آوازیں تھیں جو سمعیٔ یادداشت میں مدھم پڑ چکی تھیں انھوں نے دوبارہ سانسیں لینا شروع کردیں اس مرتبہ ہمارا قیام شہر کے ایک گنجان آبادی والے علاقے میں رہا جہاں ان بھولی بسری آوازوں نے سوئی ہوئی یادداشتوں میں بیداری کی لہر دوڑادی یہ آوازیں تھیں" والا" کی۔آپ سوچ رہے ہونگے کہ یہ ''والا'' کیا ہے تو اتنا تو بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ ممکنہ طور پر آپ اس ''والا'' کی آواز کے عادی نہ ہوں مگر شناسا ضرور ہونگے یہ پہلا والا" جو صبح کے اوقات کی سب سے نمایاں آواز ہوتی ہے یعنی آلو والا ٹنڈے گوبھی والا بیگن لے لو تازہ سبزی لے لو۔اب آپ کو چاہے ضرورت ہو نہ ہو مگر یہ آوازیں سننا پڑتی ہیں اور دیر تک اس آواز کی گونج سماعتوں کا پیچھا کرتی رہتی ہے اس آواز کا ابھی دم بھی نہیں ٹوٹتا کہ دوسری مسحور کن آواز گونجتی ہے یعنی ردّی پیپر والا پرانا سامان لینے والا سلائی مشین کا اسٹینڈ لینے والا۔اس" والا" کی آواز میں اس قدر کشش ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے اسے پرانا سامان نہ بھی ہو پھر بھی اسے اپنا سارا نیا سامان ہی دیدو۔ یہ پرانا سامان لینے والے عام تجارتی طرز سے قدرے مختلف ہوتے ہیں کیونکہ باقی سب آواز لگانے والے یہ چاہتے ہیں کہ سامان بکِے اور جیب میں کچھ پیسے آئیں اور پرانا سامان لینے والے جیب میں پیسے لے کر نکلتے ہیں کہ جیب سے پیسے جائیں اور سامان آئے یہ بکنے والے مال کی تلاش میں رہتے ہیں مگر ان بیچاروں کی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی ورنہ بکنے والا مال تو ہماری اسمبلیوں میں بھرا پڑا ہے، آدمی خریدو، ضمیر خریدو، ایمان خریدو۔ایسا لگتا ہے کہ یہ جیتتے ہی بکنے کے لیئے ہیں اسی لیئے ان کی حیثیت بھی ردّی پیپر سے زیادہ نہیں ہوتی ابھی ردی پیپر والے کی آواز سماعتوں سے دور ہوئی ہوتی ہے کہ اندرونِ سندھ سے لائے گئے بھکاری جو فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں اور حسب تمنا اور علاقے کے مکینوں کا معیار دیکھ کر اللہ کے نام پر مانگتے ہیں یہ مانگنے والے اپنے کام کے ماہر ہوتے ہیں اور مختلف طرز اور مختلف الحان سے اپنے فنّی کمالات کا اظہار کرتے ہیں شہر میں گداگروں کی یہ تعداد دیکھ کر یہ تو یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ گزشتہ چند سالوں میں ایک پختہ عمر کی نسل پیدا ہوگئی اور سب نے ایک ہی پیشہ اختیار کرلیا اور سارے گداگر ایک ہی زبان ایک ہی ثقافت اور ایک ہی برادری کے کیوں ہیں یقیناً کوئی مقتدر طاقت کسی پلاننگ کے تحت اندرون سندھ سے لوگوں کو لاکر شہر کراچی کی خوبصورتی کو داغدار کررہی ہے صاحبانِ اختیار نے چاہا تھا کہ وہ اندرونِ سندھ کو بھی مثل کراچی جگمگا ئینگے مگر ایسا کر نہ

پرانا سامان لینے والے جیب میں پیسے دینے کے لیے لے کر نکلتے ہیں

سکے تو انھوں نے شہر کراچی کو اندرون سندھ کی شکل میں ڈھال دیا اب شہر کی ٹوٹی سڑکیں ۔غلاظتوں کے ابلتے گٹر۔کوڑے کرکٹ کے ڈھیر۔ٹریفک کے قوانین کی بے ضابطگیاں ۔ اندرون سندھ سے لائے ہوئے چنچی ڈرائیوروں کا مافیا۔گڈ گورنس کے منہ پر ایک تھپڑ سے کم نہیں ۔مگر بے حس صاحبانِ اختیار و اقتدار کہ جو دیدۂ بینا رکھتے ہوئے بصارتوں سے محروم ہیں اور اپنی اندھی آنکھیں اس لیئے نہیں ملا پاتے کہ آنکھ اُٹھانے کی تاب نہیں۔دیکھیئے بات چلی تھی آوازوں سے اور پہونچی بصارتوں تک ۔ پر ایسا لگتا ہے کہ شہر کراچی میں نہ آوازوں میں سچائی ہے نہ بصارتوں میں بینائی ہے تو یہ آوازیں کس کی ہیں یہ آنکھیں کن کی ہیں یہ سوال ہے دلِ مضطر کا اور قیام تھا تیس دن کا شہرِ کراچی سے واپس آتے ہوئے داغ دہلوی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے آگئے کہ:

تمہارا دل مرے دل کے برابر ہو نہیں سکتا
وہ شیشہ ہو نہیں سکتا یہ پتھر ہو نہیں سکتا

❀❀❀

"فرید ذکریا بھارتی نژاد امریکی دانشور۔ صحافی۔ اینکر پرسن ہیں۔ انہوں نے یہ مقام اپنی ذہانت اور محنت سے حاصل کیا ہے۔ ان کی زیر ترجمہ کتاب Post American World تاریخ۔ جغرافیے۔ فلفسے۔ سیاسیات اور معاشیات کا مستند احاطہ کرتی ہے۔ 'اطراف' کے خیال میں ہر پاکستانی کو ان حقائق سے آگاہ ہونا چاہئے۔ اسی لیے ہم پاکستان کی صف اوّل کے مترجم اور مصنّف سید عرفان علی یوسف سے اُردو میں منتقل کروا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے حقائق جانئے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔"

عیسائی چرچ۔ بادشاہوں کی طاقت کا مقابلہ کرسکتا تھا

قسط نمبر 7

تحریر: فرید ذکریا
تلخیص وترجمہ: سید عرفان علی یوسف

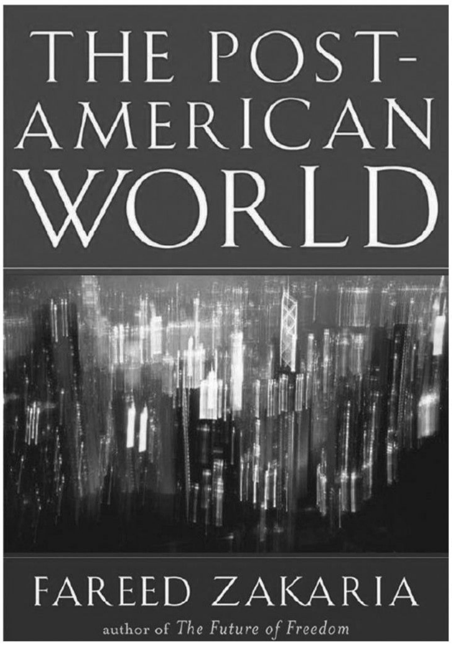

اس قسم کی مرکزی ریاست کو یورپ میں محدود کیوں کیا گیا، حالانکہ یہ غیر مغربی دنیا کے بیشتر حصوں میں پروان چڑھی ہے؟ جزوی طور پر عیسائی چرچ کی وجہ سے، جو پہلا بڑا ادارہ تھا جو بادشاہوں کی طاقت کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ جزوی طور پر یورپ کی زمینی اشرافیہ کی وجہ سے، جس کا دیہی علاقوں میں ایک آزاد مرکز تھا اور اس نے شاہی مطلق العنانیت پر ایک چیک کے طور پر کام کیا۔ (میگنا کارٹا، مغربی دنیا کا پہلا عظیم "حقوق کا بل"، درحقیقت بارونیل مراعات کا ایک چارٹر تھا، جس سے اس کے رئیسوں نے بادشاہ کو مجبور کیا تھا۔ یورپ وسیع ندیوں، اونچے پہاڑوں اور بڑی وادیوں سے بکھرا ہوا تھا۔ اس ٹوپوگرافی نے بہت سی قدرتی سرحدیں پیدا کیں اور مختلف سائز کی سیاسی برادریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ شہری ریاستوں، ڈچیوں، جمہوریتوں، قوموں اور سلطنتوں کے بننے میں حصہ لیتے ہیں۔ 1500 میں، یورپ میں پانچ سو سے زیادہ شہری ریاستیں تھیں۔ اس تنوع کا مطلب یہ تھا کہ خیالات، لوگوں، فن، پیسے اور ہتھیاروں کا مسلسل مقابلہ تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ ایک جگہ بدسلوکی کی گئی وہ دوسری جگہ فرار ہوسکتے اور ترقی کی منازل طے کرسکتے تھے۔ کامیاب ہونے والی ریاستوں کو دہرایا گیا۔ جو ناکام ہوئے وہ مرگئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ، اس مقابلے نے یورپ کو دولت کمانے اور جنگ کرنے دونوں میں انتہائی مہارت حاصل کرنے میں مدد کی۔

ایشیا، اس کے برعکس، وسیع میدانی علاقوں پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر روس کے میدانی علاقے، چین کے میدانی علاقے۔ فوجیں ان علاقوں سے تیزی سے اور تھوڑی مزاحمت کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہیں۔ (چینیوں نے عظیم دیوار تعمیر کی کیونکہ وہ اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے کسی قدرتی رکاوٹ پر بھروسہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس جغرافیہ نے بڑی، مرکزی زمینی سلطنتوں کو برقرار رکھنے میں مدد کی جو صدیوں تک اقتدار پر اپنی گرفت برقرار رکھنے کے قابل تھیں۔ مثال کے طور پر، اس واقعہ پر غور کریں جس کے ساتھ ہم نے اس باب کا آغاز کیا۔ منگ خاندان نے ژینگ ہی کے بحری سفر کے بعد سمندری مہمات کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سمندری مہمات پر پابندی کے بارے میں شاید سب سے قابل ذکر حقیقت یہ تھی کہ اس نے کام موثر کام کیا۔ ایسی پالیسی یورپ میں نافذ نہیں ہوسکتی تھی۔ کوئی بادشاہ اتنا طاقتور نہیں تھا کہ وہ اس طرح کے فرمان کو نافذ کرسکے، اور اگر کوئی ہوتا تو بھی عوام اور ان کی مہارت کسی پڑوسی ملک، شہر ریاست یا سلطنت میں منتقل ہو جاتی۔ چین میں، شہنشاہ وقت کو واپس کرسکتا تھا۔

یورپ کی آبی گزرگاہیں بھی ایک نعمت تھیں۔ اس کے دریا آہستگی سے محفوظ، بحری خلیجوں میں بہتے تھے۔ رائن ایک وسیع، سست رفتاری سے چلنے والا دریا ہے جسے سامان اور لوگوں کے لیے شاہراہ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بحیرہ روم پرسکون ہے، تقریباً ایک جھیل کجا جیسا، جس میں بہت سی بڑی بندرگاہیں ہیں۔ اس کا موازنہ افریقہ سے کریں۔ دوسرا سب سے بڑا براعظم ہونے کے باوجود، افریقہ میں سب سے مختصر ساحلی پٹی ہے، جس کا بیشتر حصہ بڑی بندرگاہوں کی تعمیر کے لیے بہت کم ہے۔ اس کے زیادہ تر بڑے دریا تیزی سے چلنے والے، ڈرامائی، عمودی، بحری نہیں ہیں۔ اس میں گرمی، بیماری اور کھانے کی خرابی کا رجحان شامل کریں، اور آپ کے پاس افریقی پسماندگی کے لیے ایک زبردست جغرافیائی وضاحت آجاتی ہے۔ یقیناً یہ واحد عنصر نہیں، لیکن اہم ہے۔ بعض اوقات، مشکلات کو شکست دی جاسکتی ہے۔ اپنے جغرافیائی تنوع کے باوجود، یورپ کو ایک بار ایک عظیم زمینی سلطنت، روم نے فتح کرلیا تھا۔ مشرق وسطیٰ نے ایک موقع پر ایک وسیع سلطنت کے تحت اچھا کام کیا۔ چین اپنے ہموار جغرافیہ کے باوجود صدیوں تک ترقی کرتا رہا، ہندوستان میں بھی اس کے اثر ورسوخ کے ادوار گزرے۔ یورپی مفادات، ماضی میں بہت واضح، ابتدائی طور پر چھوٹے اور زیادہ تر ہتھیاروں اور جنگ کی تکنیکوں سے متعلق

> یورپ کے دریا آہستگی سے محفوظ بحری خلیجوں میں بہتے تھے

تھے۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ، مفادات کی بنا پر مغرب باقی اقوام سے آگے بڑھ گیا۔

فتوحات کا مال غنیمت

باقی دنیا کے ساتھ رابطے نے یورپ کو متحرک کیا۔ نئے سمندری راستوں، امیر تہذیبوں اور عجیب و غریب لوگوں کی دریافت نے مغرب کی توانائی اور تخیل کو ہلا کر رکھ دیا۔ یورپی جہاں بھی گئے انہیں سامان، بازار اور مواقع ملے۔ سترہویں صدی تک مغربی اقوام ہر اس خطے اور ثقافت پر اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھیں جس سے ان کا واسطہ پڑا تھا۔ بحر اوقیانوس کے اس پار کی زمینوں سے لے کر افریقہ اور ایشیا کے دور دراز خطوں تک دنیا کا کوئی بھی حصہ بچا نہیں رہا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک، یہاں تک کہ آسٹریلیا اور جنوبی بحر الکاہل کے چھوٹے جزیروں کو بھی یورپیوں کے استعمال کے لیے نشان زد کر دیا گیا۔ مشرق بعید چین اور جاپان پہلے تو اس اثر و رسوخ سے محفوظ رہے لیکن انیسویں صدی کے وسط تک وہ بھی مغربی ترقی کا شکار ہو گئے۔

مغرب کا عروج عالمی تہذیب کے آغاز کا باعث بنا۔ جس کی وضاحت، شکل، مغربی یورپ کی اقوام کے زیر تسلط تھی۔ ابتدائی طور پر، یورپیوں کی توجہ مصنوعات تلاش کرنے پر تھی جو وہ لوگ گھر واپس لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے واقعات میں، تجارت شامل تھی۔ وہ امریکہ سے کھالیں، ایشیا سے مصالحے اور برازیل سے سونا اور ہیرے وطن واپس لائے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے ان کی دلچسپیاں مختلف تھیں۔ معتدل علاقوں میں، شمالی اور جنوبی امریکہ سے شروع کر کے، یورپی باشندے آباد ہوئے، اور دور دراز مقامات پر مغربی طرز کے معاشروں کو دوبارہ تخلیق کیا۔ یہ اس کی شروعات تھی جسے وہ نئی دنیا کہتے ہیں۔ ایسی زمینوں میں جنہیں غیر آباد پایا جاتا تھا، جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ میں انہوں نے ایسی فصلیں پیدا کرنے کے لیے زراعت کا ایک نظام بنایا جو گھریلو منڈیوں میں دلچسپی کا باعث ہو۔ ڈچوں نے ایسٹ انڈیز میں وسیع فارم قائم کیے، اور پرتگالیوں نے برازیل میں کیا۔ جلد ہی کیریبین میں فرانسیسی اور انگریزی باغات نے گرہن لگا دیا، جو افریقیوں کو مزدوری کے لیے غلاموں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

بتدائی یوروپی رابطے کے سو سال کے اندر، ایک رجحان غیر واضح اور ناقابل واپسی تھا: ان مقابلوں نے غیر مغربی معاشروں میں موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی انتظامات کو تبدیل یا تباہ کر دیا۔ پرانا نظام ٹوٹ گیا یا تباہ ہو گیا۔ یہ بات ملک کے سائز سے قطع نظر، چھوٹے برما سے لے کر، جہاں برطانوی حکمرانی میں روایتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا، افریقہ کے بڑے قبائل تک، جہاں یورپی اقوام نے نئی سرحدیں کھینچیں، نئی تقسیمیں پیدا کیں، اور اپنی پسند کی طاقت رکھی۔ بہت سے معاملات میں، اس بیرونی اثر و رسوخ نے گروہوں کو جدیدیت سے متعارف کرایا، یہاں تک کہ اگر کبھی کبھار انہوں نے بڑی سفاکیت بھی کی۔ دوسرے معاملات میں، یورپی اثر و رسوخ رجعت پسند تھا، پرانے طریقوں کو تباہ کر رہا تھا لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے بہت کم پیدا کر رہا تھا۔ امریکہ، ایشیا اور افریقہ مغرب کی دریافت سے ہمیشہ کے لیے اور ناقابل واپسی طور پر تبدیل ہو گئے۔

یورپی راستوں کے سو سال کے اندر پہلے اقتصادی انتظامات تباہ کر دیے تھے

یورپی توسیع کی سمت کا تعین طاقت کے توازن سے ہوتا تھا۔ کئی صدیوں تک، سمندروں پر اپنی مہارت کے باوجود، یورپی اقوام کو ترکوں اور عربوں پر کوئی فوجی برتری حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے انیسویں صدی کے اوائل تک مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی سرزمینوں کے ساتھ تجارت کی لیکن غلبہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایشیا میں، یورپیوں نے براعظم میں جانے کے چند آسان راستے دیکھے اور اس کے بجائے تجارتی چوکیاں اور دفاتر قائم کیے اور چینیوں کی طرف سے نظر انداز کیے گئے جانے پر مطمئن رہے۔ سب صحارا، افریقہ اور امریکہ میں، اس کے برعکس، وہ مقامی لوگوں سے واضح طور پر مضبوط تھے۔ پرتگالی پھیلاؤ افریقہ میں شروع ہوا، سولہویں صدی کے اوائل میں کانگو اور زمبیزی میں منتقل ہوا۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا آباد ہونے کے لیے ناگوار تھی، اس لیے انھوں نے مغربی نصف کرہ کا رخ کیا۔

امریکہ کی دریافت غلطی تھی۔ کولمبس ہندوستان کا راستہ تلاش کر رہا تھا لیکن یہ ایک خوش کن حادثہ ثابت ہوا۔ امریکہ چار سو سالوں کے لیے یورپ کے فراریوں کا مسکن بن گیا۔ یورپی لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر نئی دنیا کے لیے روانہ ہوئے۔ گھر میں بھیڑ، غربت اور مذہبی ظلم وستم یا محض مہم جوئی کی خواہش سبب بنی اور جب وہ اترے تو انھیں ایسی تہذیبیں ملیں جو کچھ طریقوں سے نفیس تھیں لیکن عسکری طور پر قدیم تھیں۔ یورپی مہم جوئی میں کارٹیس، پیزارو کے چھوٹے عسکری دستے بہت بڑی مقامی فوجوں کو شکست دے سکتے تھے۔ مقامی لوگ بیرونی حملے برداشت نہیں کر سکے اور قبائل اور ثقافتوں کی تھوک تباہی کا باعث بنے۔

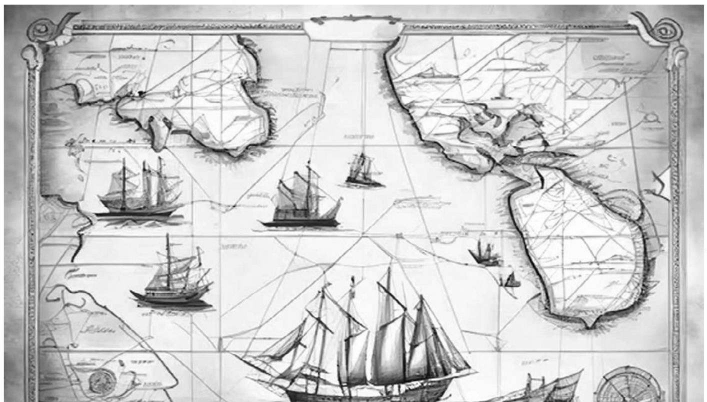

نوآبادیات اکثر ممالک کے ذریعہ نہیں بلکہ کارپوریشنوں کے ذریعہ قائم کی جاتی تھیں۔ ڈچ اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنیاں لائسنس یافتہ اجارہ داریاں تھیں، جو ہر ملک کے تاجروں کے درمیان مقابلہ ختم کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ابتدائی طور پر، یہ تجارتی ادارے علاقے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور صرف منافع سے متعلق تھے، لیکن ایک بار نئے شعبوں میں سرمایہ کاری کے بعد، وہ مزید استحکام اور کنٹرول چاہتے تھے۔ اس دوران یورپی طاقتیں حریف ممالک کو باہر رکھنا چاہتی تھیں۔ اس طرح زمینوں پر قبضے اور باضابطہ سلطنتوں کی تعمیر شروع ہوئی، جن میں سے برطانیہ سب سے بڑا بن گیا۔

رسمی سلطنت کے ساتھ عزائم بھی آئے۔ مغرب والوں نے صرف پیسے سے آگے طاقت، اثر و رسوخ اور ثقافت کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ یورپی اداروں، طریقوں، اور نظریات کو متعارف کرایا گیا اور نافذ کیا گیا، اگرچہ ہمیشہ نسلی ترجیحات کو برقرار رکھا گیا تھا۔ مثال کے طور پر، برطانوی عدالتی نظام کو ہندوستان میں لایا گیا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ، ان کالونیوں پر یورپی

اثرات بہت زیادہ بڑھتے گئے۔ نیل فرگوسن کا کہنا ہے کہ برطانوی سلطنت انگریزی زبان، بینکنگ، عام قانون، پروٹسٹنٹ ازم، ٹیم اسپورٹس، محدود ریاست، نمائندہ حکومت، اور آزاد خیالی کے دنیا بھر میں پھیلاؤ کے لیے ذمہ دار ہے۔ ساتھ ہی سامراجی کنٹرول کی منافقت اور بربریت، معاشی لوٹ مار، اجتماعی پھانسی، قید، تشدد کو بھی فروغ دیا۔ یہ ناقابل تردید ہے کہ یورپی نظریات اور طرز عمل نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہاں تک کہ مشرق بعید میں، جہاں مغرب نے کبھی رسمی الحاق نہیں کیا، یورپی اثرات بڑے پیمانے پر تھے۔ جب انیسویں صدی کے اوائل میں کمزور اور غیر فعال چنگ عدالت نے افیون کی تجارت پر پابندی لگانے کی کوشش کی تو برطانیہ نے جس کا خزانہ افیون سے حاصل ہونے والی آمدنی کا عادی ہو چکا تھا بحری حملہ کر دیا۔ اینگلو چینی جنگیں، جنہیں اکثر افیون کی جنگیں کہا جاتا ہے، 1842 میں طاقت کے فرق کے نتیجے میں بیجنگ کو اتفاق پر مجبور کر دیا۔ افیون کی تجارت کے دوبارہ شروع ہونے کے بعد ان کی مراعات پر: چین نے ہانگ کانگ کو چھوڑ دیا اور برطانوی باشندوں کے لیے پانچ بندرگاہیں کھول دیں، تمام برطانویوں کو چینی قوانین سے استثنیٰ دیا، اور ایک بڑا معاوضہ ادا کیا۔ 1853 میں، مغربی بحری جہاز اس بار امریکی جاپانی پانیوں میں داخل ہوئے اور جاپان کی دنیا سے ''تنہائی'' کی پالیسی کو ختم کر دیا۔ بعد ازاں تجارتی معاہدوں کی ایک سیریز پر دستخط کیے گئے جس میں مغربی ممالک اور ان کے شہریوں کو خصوصی مراعات دی گئیں۔ رسمی سلطنت بھی بڑھتی رہی، بیمار عثمانی سلطنت افریقہ تک پھیل گئی تھی۔ تسلط کا یہ عمل بیسویں صدی کے اوائل میں اختتام پذیر ہوا، اس وقت مٹھی بھر مغربی دارالحکومتوں نے دنیا کی 85 فیصد زمین پر حکومت کی۔

ابتدا میں یورپی اقوام کو ترکوں اور عربوں پر فوجی برتری حاصل نہیں تھی

مغربیت

1823 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مقامی لوگوں کو تربیت دینے کے لیے کلکتہ میں ایک اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس پالیسی کے خلاف کلکتہ کے ایک سرکردہ ہندوستانی شہری راجہ رام موہن رائے کی طرف سے برطانیہ کے وزیر اعظم ولیم پٹ کے نام ایک آتش گیر خط لکھا:

خط میں کہا گیا کہ ہندستانیوں کو تہذیب سکھانے کے لیے یہ مدرسہ تجویز کیا گیا ہے، ہم امید کرتے تھے کہ یہ رقم ہندوستان کے باشندوں کو ریاضی، فطری فلسفہ، کیمسٹری، اناٹومی اور دیگر مفید علوم کی تعلیم دینے کے لیے خرچ کی جائے گی اور ہنر مند یورپی حضرات کو ملازمت دی جائے گی۔ وہ علوم، جنہیں یوروپ کی اقوام نے کمال کے درجے تک پہنچایا ہے اب انہیں دنیا کے دوسرے حصوں کے باشندوں کو بھی حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہندو پنڈتوں کے تحت ایک سنسکرت اسکول قائم کر رہی ہے تا کہ ایسا علم فراہم کیا جا سکے جیسا کہ ہندوستان میں پہلے سے موجود ہے۔ اس مدرسے سے صرف یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نوجوانوں کے ذہنوں کو گرائمر کی خوبیوں اور مابعد الطبیعاتی امتیازات سے بھرے گا جو معاشرے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ سنسکرت زبان، اس قدر مشکل ہے کہ اس کے کامل حصول کے لیے تقریباً ایک زندگی کا وقت ضروری ہے۔ ویدانت کے تجویز کردہ موضوعات کون سے ہیں؟ روح کس انداز میں دیوتا میں جذب ہوتی ہے؟ اس کا جوہر الٰہی سے کیا تعلق ہے؟ جب بھی آپ یہ دلیل سنتے ہیں کہ مغربیت خالصتاً ہتھیاروں اور طاقت کا معاملہ ہے تو اس خط کے بارے میں سوچیں اور اس جیسے سینکڑوں خطوط، میمو اور آرڈرز بھی اہم ہیں۔ مغربی افکار کے پھیلاؤ کے پیچھے جبر کا نظام تھا، لیکن بہت سے غیر مغربی لوگ بھی تھے جو مغرب کے طریقے سیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اس کی وجہ سادہ تھی۔ وہ نقل کر کے کامیابی چاہتے تھے، اور لوگ ہمیشہ کامیاب ہونے والوں کی نقل کرتے ہیں۔

دولت اکٹھا کرنے اور جنگ چھیڑنے میں مغرب کی مہارت سترھویں صدی تک اس کے پڑوسیوں پر عیاں تھی۔ ان میں سے ایک، روس کے زار پیٹر دی گریٹ نے مہینوں یورپ کا سفر کرتے ہوئے، اس کی صنعتوں اور اس کی فوجی طاقت کا مشاہدہ کیا۔ وہ وطن واپس آیا اور نئی بنیاد پرست اصلاحات کا حکم دیا: فوج کو یورپی خطوط پر دوبارہ منظم کرنا، بیوروکریسی کو جدید بنانا، دارالحکومت کو ایشیائی ماسکو سے روسی سلطنت کے مغربی کنارے پر ایک نئے یورپی طرز کے شہر میں منتقل کرنا اس کا مقصد تھا۔ اس کا نام اس نے سینٹ پیٹرز برگ رکھا۔ اس نے ٹیکس کوڈ میں اصلاحات کیں اور یہاں تک کہ آرتھوڈوکس چرچ کے ڈھانچے کو مزید مغربی بنانے کے لیے اس کے ساتھ منسلک کیا۔ مردوں کو داڑھی منڈوانے اور یورپی طرز کے لباس پہننے کا حکم دیا گیا تھا۔ اگر کوئی آدمی پرانے طریقوں پر قائم رہے تو اسے سالانہ ایک سو روبل داڑھی پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ پیٹر دی گریٹ کے بعد غیر مغربی لوگوں کی ایک طویل، ممتاز فہرست ہے جنہوں نے مغرب کے نظریات کو اپنے ممالک تک پہنچانے کی کوشش کی۔ کچھ پیٹر کی طرح بنیاد پرست رہے۔ شاید ان میں سے سب سے مشہور کمال اتاترک تھے جنہوں نے 1922 میں منہدم ہونے والی عثمانی ریاست پر قبضہ کر کے مغربی جموریت کے نام پر فوجی آمریت قائم کی اور اعلان کیا کہ ترکی کو اپنا ماضی چھوڑنا ہوگا اور "مغرب کے ساتھ ترقی" کے لیے یورپی ثقافت کو اپنانا ہوگا۔ اس نے ایک سیکولر جمہوریہ بنائی، ترک رسم الخط کو عربی سے رومانوی کیا، پردہ کو ختم کیا، اور خلافت عثمانیہ کی تمام مذہبی بنیادوں کو ختم کر دیا۔ اس سے قبل جاپان میں 1885 میں میجی ریفارمیشن کے عظیم نظریہ دان یوکیچی فوکوزاوا نے ایک مشہور مضمون ''لیونگ ایشیا'' لکھا تھا جس میں اس نے دلیل دی تھی کہ جاپان کو ایشیا بالخصوص چین اور کوریا سے منہ موڑنے کی ضرورت ہے۔" بہت سے چینی مصلحین نے اسی طرح کے دلائل دیے۔ سن یات سین نے دوٹوک الفاظ میں یورپ کی اعلیٰ حیثیت اور آگے بڑھنے کے لیے اس کی نقل کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کا خیال تھا کہ اپنے ملک کی ''پسماندگی'' کو ختم کرنے کے لیے مغرب سے سیاسی اور اقتصادی طور پر قرض لینے کی ضرورت ہے۔ ہیرو اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، وہ ایک مغربی لبرل نقطہ نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک بارنجی طور پر خود کو ''ہندوستان پر حکمرانی کرنے والا آخری انگریز'' قرار دیا۔ دنیا بھر میں نہرو کے ہم عصر بھی اسی طرح مغربی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ (جاری ہے)

نہرو نے اپنے آپ کو ہندوستان پر حکمرانی کرنے والا آخری انگریز کیوں کہا؟

رقصِ یعنی (غزلیں)

رقصِ یعنی (غزلیں) پر سینئر شاعر نقاد نسیم سحر کا تبصرہ

ماہنامہ تخلیق لاہور دسمبر 2024

شاعر: محمود شام
صفحات: 183
قیمت: 1500 روپے
ناشر: اٹلانٹس ڈیجیٹل پرنٹرز، کراچی

جناب محمود شام سینئر اور معروف صحافی بھی ہیں جو مختلف ادوار میں ''الفتح'' اور دیگر ہفت روزہ جرائد کے ذریعے قومی اور بین الاقوامی امور پر اپنی دانشورانہ رائے دیتے رہے ہیں۔ لیکن اہل ادب جانتے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے تخلیقی شاعر بھی ہیں۔ ان کے زیر ادارت جرائد کے علاوہ دیگر ادبی جرائد میں بھی اُن کا کلام بارہا پڑھنے کا موقع ملا۔ مختلف فورمز کے علاوہ اکثر ان سے ہوائی جہاز میں ملاقات ہوتی تھی کہ ان کی صحافتی سرگرمیوں کے باعث انہیں ملک کے طول وعرض اور بیرون ملک بھی جانا ہوتا تھا، اور راقم السطور کے پاؤں میں بھی روزی روٹی کا چکر تھا جس میں ہوائی اسفار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہی محمود شام اب ایک ایسا شعری مجموعہ ''رقص یعنی'' لے کر آئے ہیں جو اگرچہ 'یعنی' کے مشابہ لفظ سے جون ایلیا کے اسی نام کے شعری مجموعے کی یاد دلاتا ہے، مگر یقین کیجیے ''رقص یعنی'' کا رقص والہانہ ایک ایسا منظر انداز کا ہے جس سے کسی بھی دوسری کتاب کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آج سے کوئی تین عشرے قبل کی بات ہے کہ ''تخلیق'' میں ''یعنی'' کی ردیف میں ان کی کچھ غزلیں شائع ہو رہی تھیں اور ان کی دھوم سعودی عرب کے ادبی حلقوں تک مچ رہی تھی۔ مجھ سمیت کچھ دوستوں نے ان کی تقلید میں اسی ردیف میں غزلیں بھی کہیں، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی! اب ایک سو چوراسی صفحات کا یہ مجموعہ ''رقص یعنی'' شائع ہوا ہے تو بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اکیاون غزلیں محمود شام کی تقریباً تین عشروں پر محیط شعری و تخلیقی ریاضت کا حاصل ہیں۔ خود مصنف کا کہنا ہے کہ ''وارداتیں بیسویں صدی کی ہیں، اشاعت اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہو رہی ہے''۔

''رقص یعنی'' کی شاعری ایک ہی بحر اور ایک ہی ردیف میں کتاب کے عنوان کے دو لفظوں کی پرکار کے گرد گھومتے ہوئے جمالیاتی انداز میں بے شمار آسمانی اور زمینی کیفیات کے منظر نامے پیش کرتی ہے۔ اکاون کا ہندسہ بھی ایک کلیدی ہندسہ ہے اور ان کی اکاون غزلیں اپنے ہر شعر میں آپ پر کوئی نیا جہان روشن کرتی ہیں۔ اس کا سرورق عالمی شہرت یافتہ مصور مہتاب علی کے موئے قلم کا کمال ہے ہوا۔ اندرونی صفحات پر اکاون غزلوں کے ساتھ محمود شام کی بھانجی اور با کمال مصورہ ثنا ناصر نے تزئینی جوہر دکھائے ہیں، اور ہر غزل کے ساتھ ایک مختلف انداز کا رقص کرتی ہوئی رقاصہ دکھائی ہے۔ ان اکاون غزلوں کے ساتھ اکاون رنگین خاکے اور اسی رقص کے پوز میں اکاون سادہ خاکے بھی شامل ہیں۔ بلاشبہ مصوری کا یہ ماہرانہ کمال اس کتاب کی اہمیت اور وقعت میں دو چند اضافہ کر رہا ہے۔ کتاب کا انتساب بھی محمود شام کے جمالیاتی مزاج کی عکاسی کر رہا ہے:

جزو تدریس ہوں الفت کے رموز
عاشقی شعبۂ لازم یعنی

کتاب کا دیباچہ معروف نقاد، اور شاعرہ ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر نے لکھا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اس تنقیدی شعور کا حق ادا کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ وہ جدید دور کی حسیات اور غزل کے نئے موسموں سے آشنا ہیں۔ چنانچہ انھوں نے رقصِ یعنی کی روح میں اتر کر جو طویل دیباچہ تحریر کیا ہے وہ بھی قاری کو تا دیر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ راقم السطور عموماً کتاب کے دیباچے پڑھنے سے پہلے کتاب کا متن پڑھتا ہے، لیکن عنبرین حسیب عنبر کا دیباچہ ہر قاری کو پہلے پڑھنا چاہیے

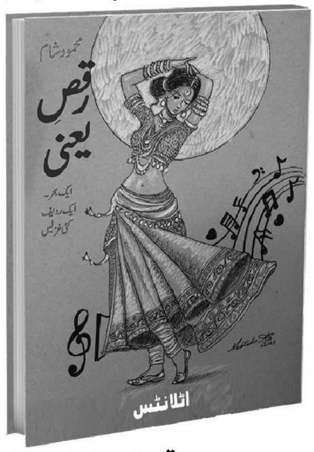

کہ جس انداز میں انھوں نے ''رقص یعنی'' کی ترکیب لفظی کے ساتھ غزلوں کے معنی پرت در پرت کھولے ہیں، ان سے قاری پر ابلاغ اور تفہیم کے وہ خطے بھی روشن ہو جائیں گے جو براہ راست یہ اکاون غزلیں پڑھ کر شاید اس پر نہ کھل سکیں۔ اس دیباچے سے یہ اقتباس ان کے تنقیدی آفاق کے ساتھ ساتھ محمود شام کی شاعری کی رمزیں بھی کھول رہا ہے۔ ''محمود شام کی یہ شاعری گہری خود شناسی اور مدھر غنائیت کے ایک مینار کی صورت کھڑی ہے۔ وہ ایک ماہر خطاط کی طرح جذبات کے کینوس پر لفظوں کے سٹروکس سے ہر ہر مصرع پینٹ کرتے ہیں اور شاعری کو ایسے راگ میں ڈھال دیتے ہیں جو روح میں گونجتا ہے۔ ان کی یہ شاعری محض اشعار کی قرأت نہیں، بلکہ محبت، آرزو اور انسانی وجود کی بھول بھلیوں کے مناظر سے گزرنے کا سفر ہے۔ اس کتاب میں محمود شام نے خاص موضوع اور احساس کی یکتائی کو ایک ردیف و بحر میں مجمع کیا ہے تا

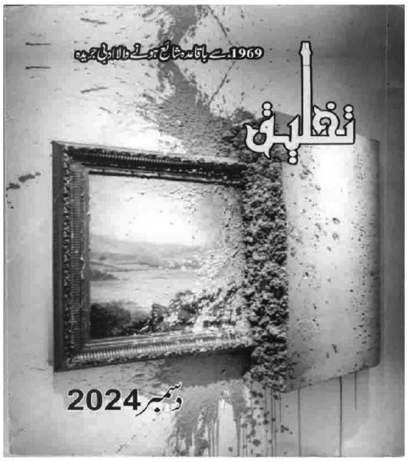

کہ پڑھنے والا اس خاص فضا اور جذبے کو پوری طرح محسوس کر سکے''۔ راقم السطور اس رائے سے پوری طرح متفق ہے کہ محمود شام شہری ملکی اور بین الاقوامی تینوں منظر ناموں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان تینوں سطحوں کے مابین بُنے جانے والے تانوں بانوں کو دیکھ بھی سکتے ہیں اور سمجھ بھی سکتے ہیں جو عام آنکھ اور ذہن کے بس کی بات نہیں۔ بلاشبہ یہ شاعری رومانوی جھلکیاں دکھاتے ہوئے بھی محض رومانویت سے بالاتر ہے اور گہرے ہمہ گیر موضوعات میں یوں ڈھلتی ہے کہ انسانی تجربات میں موجود گہرائی اور پیچیدگی کو بھی خود میں سمیٹ لیتی ہے۔ جناب محمود شام کی اس کتاب میں سے کچھ چنیدہ اشعار ملاحظہ ہوں، اگرچہ سبھی عمدہ اشعار میں سے کچھ اشعار کا انتخاب کرنا قدرے مشکل ہے مگر ان کے شعری اور فکری تنوع کے ترجمان یہ اشعار خاص طور پر اچھے لگے ہیں:

رات بھر اس کو ہی تکتے رہنا
دن میں بھی اس کے ہی خواہاں یعنی

جو بھی لمحات ہیں تجھ بن یعنی
کاٹنے پڑتے ہیں گن گن یعنی

عشق جینے کا ہے مقصد یعنی
عشق ہر سانس کی آمد یعنی

سن کے پھر نغمۂ بارش یعنی
جاگ اٹھی تری خواہش یعنی

کیا نہیں تجھ کو زمانے سے ملا
کبھی اک رقصِ تشکر یعنی

ہم تو ہیں لوگ پرانے یعنی
یاد ہیں سارے ٹھکانے یعنی

کیسے مہکا ہوں ترے آنے سے
دیکھ مہکی ہوئی نس نس یعنی

دل کی آواز کبھی سن یعنی
کر لے منزل کا تعین یعنی

بولتی آنکھیں کہاں ملتی ہیں
اب تو ہے صرف یہی دُھن یعنی

❀❀❀

اطراف کی خوش قسمتی ہے کہ ابتدائی اشاعتوں سے ہی مہتاب اکبر راشدی جیسی متحرک اور فعال شخصیت کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں جرأت انکار نے ان کو ایک وقار اور شاخت دی اس کے بعد وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنی محنت سے پاکستان اور بیرونِ پاکستان اپنا ایک مقام بناتی چلی گئی۔ اعترافِ خدمت اعزاز کے پروگراموں میں اپنی شرکت سے نوازتی رہی ہیں۔ 2025 کے اہم سال میں انہیں اس اعزاز کی پیشکش کی گئی جو انھوں نے براہ مہربانی قبول کی۔ جہاں آراء نے اُن سے گفتگو کی اور کوشش کی ہے کہ قارئین اطراف کو اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی ہو سکے اطراف کی کی خواہش ہے کہ اس ہمہ جہت ہستی کے مختلف اقدامات اور کوششوں سے آئیدہ بھی قارئین کو متعارف کرواتے رہیں۔

ٹی وی ریڈیو میزبان، بیوروکریٹ، رکن قومی اسمبلی مہتاب اکبر راشدی

تحریر: جہاں آراء

محترمہ مہتاب اکبر راشدی پاکستان کی معروف ٹی وی اور ریڈیو میزبان، مصنفہ، سابق سیکریٹری اطلاعات رہیں قومی اسمبلی کی رُکن ہیں۔ آپ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو نوڈیرو (ضلع لاڑکانہ) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد محمد عیسیٰ چنا صاحب شعبہ تدریس سے وابستہ تھے اور بہت دور اندیش اور زمانہ شناس تھے۔ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ اپنی اعلی تعلیم و تربیت کا سہرا اپنے والد کے سر سجاتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم نوڈیرو سے حاصل کی بعد ازاں ان کے والد صاحب نے اپنی تمام بچیوں کی اعلی تعلیم کی خاطر اپنا تبادلہ حیدرآباد کروا لیا لہذا گریجویشن تک کی تعلیم انہوں نے حیدرآباد سے حاصل کی۔ اور سندھ یونیورسٹی، پاکستان سے علم سیاسیات میں ایم۔اے کی اور بی۔ایڈ کی اسناد فرسٹ کلاس فرسٹ پوریشن میں حاصل کیں۔ جس کے بعد انھیں فل برائٹ اسکالرشپ بھی ملی اور وہ مزید اعلی تعلیم کے لیے امریکا چلی گئیں جہاں سے بوسٹن شہر کی شہرہ آفاق یونیورسٹی میساچوسٹس یونیورسٹی سے علم سیاسیات کے مضمون میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ وطن واپس آ کر آپ اپنے خاص لگاؤ اور فن خطابت میں مہارت ہونے کے باعث شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گئیں۔ ابتدائی طور پر آپ نے ایک نجی اسکول میں پڑھایا اور بعد ازاں ۱۹۷۳ میں سندھ یونیورسٹی سے منسلک ہوئیں اور شعبہ بین الاقوامی تعلقات میں بطور لیکچرار اپنے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۸۱ میں ممتاز بیوروکریٹ اکبر راشدی سے شادی ہوئی۔ بعد ازاں کراچی منتقلی کے بعد وہ خود بھی بیوروکریٹ بن گئیں اور اطلاعات، تعلیم، ثقافت سمیت کئی شعبوں میں کام کیا۔ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کا کہنا ہے کہ، انہیں بیوروکریسی میں لانے والی شخصیت بینظیر بھٹو کی تھی۔ بینظیر بھٹو صاحبہ سے آپ کا تعلق اس وقت سے تھا جب آپ کی شادی ہوئی تھی۔ سیکریٹری تعلیم کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد آپ نے سندھ کے نظام تعلیم میں بہتری کے لئے کئی اہم اقدامات کئے۔ آپ کو انسٹیٹوٹ آف سندھیالوجی کی ڈائریکٹر اور پہلی خاتون سیکرٹری کلچر سندھ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ علاوہ ازیں آپ سندھ یونیورسٹی میں شعبہ مشیر بین الاقوامی طلبا کی ڈائریکٹر بنی، اس ضمن میں سندھ اور بلوچستان دونوں کے عہدے آپ کے پاس تھے۔

کتاب پڑھنا آپ کا شوق نہیں بلکہ جنون ہے یہ ہی وجہ ہے کہ آپ کے دونوں گھروں میں دو لائبریریاں قائم ہیں۔ آپ کو ابتدا ہی سے سب سے زیادہ دلچسپی شعبہ تعلیم میں رہی۔ آپ کے نزدیک تعلیم ہی ہے جو آپ کو دنیا سے جوڑتی ہے۔ تعلیم ہی ہے جو آپ کو شعور دیتی ہے اور خاص طور پر خواتین کے لیے تو ایک لازم و ملزوم چیز ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جو معاشرے میں شعور اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ زمانہ طالب علمی ہی سے ایک بہترین مقررہ بھی رہی ہیں اور ملک بھر میں اردو، سندھی اور انگریزی زبانوں میں مستند ہونے والے مباحثوں کے مقابلوں میں اپنے کالج کی نمائندگی کر کے اول پوزیشن اور خصوصی انعامات سمیت متعدد انعامات و اسناد اپنے نام کر چکی ہیں۔ آپ اپنے تمام اساتذہ بالخصوص زبیدہ کالج کی پرنسپل شمس عباسی، پروفیسر مریم سلطانہ، اور

بیرونِ ملک تعلیم نے اُنھیں سوال کرنا سکھایا

پروفیسر ذکیہ کی مرہون منت ہیں جنہوں نے آپ کی سوچ کو پروان چڑھانے اور مستقبل کے اہداف مقرر کرنے میں اہم کردار کیا ہے۔

سندھ کی پہلی خاتون سیکرٹری کلچر

اُنھوں نے اپنے گھر اور ملازمت دونوں کے فرائض کو بااحسن وخوبی نبھایا۔آپ کا کہنا ہے کہ گھر اور ملازمت کو ایک ساتھ لے کر چلنا آسان بھی ہوسکتا ہے اور مشکل بھی یہ آپ کے طرز زندگی اور ترجیحات پر منحصر ہے۔البتہ شادی کے بعد آپ کی پہلی ترجیح آپ کا گھر،شوہر اور بچے اور خاندان کے دیگر افراد رہے ہیں۔باقی تمام ذمہ داریاں آپ کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔آپ دیگر خواتین کو بھی یہ ہی پیغام دیتی ہیں کہ شادی کے بعد ملازمت کے چکر میں انہیں کبھی اپنے گھر کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہیئے۔یہ آپ کی خوبی ہے کہ آپ نے اپنی دونوں ذمہ داریوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ، ریٹائر ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن جہاں جہاں آپ نے کام کیا ہے وہاں کے لوگ آج بھی آپ کو بہت محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔

مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنی زندگی میں ملنے والے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔اسی سے آپ کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔مہتاب صاحبہ نے ابتدائی طور پر اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان حیدرآباد پر بچوں کے ایک پروگرام سے کیا تھا جہاں آپ کی ملاقات مصطفیٰ قریشی صاحب سے بھی ہوئی جن سے سیکھنے میں بہت مدد ملی۔اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان پر اسٹیشن منیجر ایم بی انصاری صاحب،امر جلیل،شمشیر الحیدری آغا سلیم زیب عاقلی صاحب نے سیکھنے کے عمل میں بہت معاونت فراہم کی۔لہٰذا ریڈیو پاکستان آپ کے لئے ایک اہم درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے بعد آپ نے ٹیلی وژن کا رخ کیا۔ٹیلی وژن پر آپ نے روشن تارہ کے نام سے بچوں کا پروگرام کیا جو بہت مقبول ہوا۔یہیں سے پاکستان ٹیلی وژن پر بھی آپ کی مقبولیت کا نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔انتخابات کے دوران محترم مستنصر حسن تارڑ اور نعیم بخاری صاحب کے ساتھ الیکشن کی نشریات پیش کرنے کا موقع بھی آپ کو ملا۔اس کے علاوہ کامیابیوں کے اس نا رکنے والے سفر میں محترمہ خوش بخت شجاعت،بشریٰ انصاری صاحبہ اور پروین شاکر صاحبہ بھی آپ کی رفیق کار رہیں۔

اپنے تعلیمی سفر کے متعلق مہتاب اکبر صاحبہ نے بتایا کہ،جب تک وہ پاکستان میں رہیں تو اتنی مشکلات پیش نہیں آئیں کیونکہ یہاں اسکول،کالج اور یونیورسٹی کی ہر سطح پر آپ کے اساتذہ آپ کی بھرپور حوصلہ افزائی فرماتے تھے لیکن بیرون ملک تعلیم میں آپ کو کچھ چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔کیونکہ ان کے درس وتدریس کا طریقہ ہم سے الگ ہوتا ہے۔یہاں استاد سے سوالات کرنے کی اتنی چھوٹ نہیں ہوتی ہے لیکن باہر سوالات نا کرنے والوں کو کند ذہن تصور کیا جاتا ہے۔امریکہ کے

زندگی بھر شعبۂ تعلیم سے دلچسپی رہی

نظام تعلیم نے آپ کو سوال کرنا سکھایا اور آپ کی شخصیت کے اعتماد کو بڑھایا۔اس کے بعد آپ نے دنیا بھر کے سفر تنہا کئے۔سرکاری طور پر متعدد ملکی اور غیر ملکی فلاحی اداروں کے لئے بطور ڈائریکٹر سمیت کئی اہم اور بڑے عہدوں پر رہ کر آپ نے اپنے فرایض انجام دیئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے اخبارات میں کالم لکھنا شروع کئے۔آپ پانچ سال مسلسل سندھی ''اخبار عوامی آواز'' میں لکھتی رہیں۔کالموں پر مشتمل دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔اس کے علاوہ آپ کی زندگی پر بھی ایک کتاب ''مہتاب کے نام'' سے لکھی گئی جسے آپ نے شائع کروایا۔اس کے علاوہ آپ نے سندھ کی کچھ اہم شخصیات پر ایک کتاب ''سنین سنیان وند'' کے نام سے لکھی۔اس کے بعد آپ نے ایک کتاب ''منھنجی سوچ منھنجو قلم'' یعنی میری سوچ میرا قلم کے نام سے تحریر کی۔ایک کتاب زیر تدوین ہے۔

اپنے مستقبل کیلئے آپ کے کیا اہداف ہیں کے بارے میں مہتاب اکبر صاحبہ کا کہنا ہے کہ،''عمر کے اس حصے میں جبکہ میں اب ۷۸ سال کی ہوگئی ہوں اہداف تو کوئی خاص نہیں ہیں بس یہ ہے کہ میں نے

مہتاب اکبر راشدی اعترافِ خدمت اعزاز 2025

آپ آپے سے باہر ہو جائیں جو اقدار ہمیں سکھا گئیں یعنی بڑوں کا ادب کرنا، دوسروں کی رائے کا احترام کرنا ان کی پاسداری لازم ہے۔ علاوہ ازیں بچیوں کے لئے خاص پیغام یہ ہے کہ وہ اعتماد سے چلیں، اپنی صلاحیتوں کو پہچانیں اور اپنی زندگی میں توازن پیدا کریں۔ پڑھائی کی طرف خاص دھیان دیں اور اپنے پیشے میں جتنا آگے جاسکتی ہیں جائیں''۔

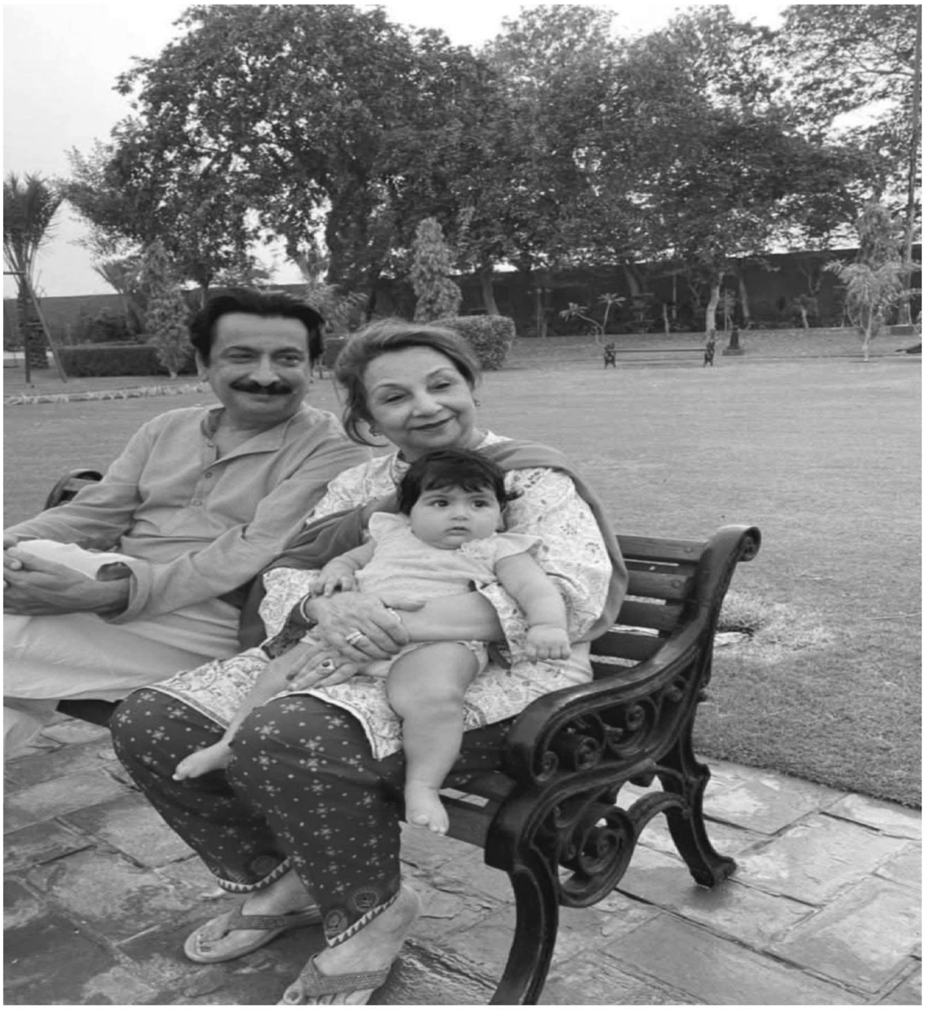

مہتاب اکبر راشدی صاحبہ کی شخصیت ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہے۔حکومت پاکستان نے انھیں 14 اگست 2003 کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا تھا۔

جتنا کام کیا ہے میں اس کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مثلاً: کتابوں کو پرنٹ کررہی ہوں، جو میں نے ٹیلی ویژن پر اردو اور سندھی میں انٹرویوز لیئے ہیں ان کو بھی یکجا کر رہی ہوں کیونکہ میں انہیں شائع کروانا چاہتی ہوں یہ میرے سامنے بہت بڑا کام ہے جو میں کرنا چاہتی ہوں اور انشاءاللہ کرلوں گی۔

نسل نو کے لیے آپ کا کہنا ہے کہ''نسل نو تو اب ہماری استاد ہے۔ان کی تربیت اچھی ہونی چاہیے، ان کو اپنی رائے پر بھروسہ کرنا چاہیے۔اس زمانے میں جب ٹیکنالوجی کا دور ہے اور ہم اس میں پیچھے

> **گھر اور ملازمت دونوں فرائض بحسن وخوبی انجام دیے**

ہیں اور ہماری نسل آگے ہے، ان میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کو بتانے کی ضرورت ہے کہ ٹیکنالوجی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

جیسمین پطرس اعترافِ خدمت اعزاز 2025

اعترافِ خدمت اعزاز میں ”اطراف“ نے نرسنگ کے شعبے کو فوقیت دی انڈس ہسپتال کی ایک نرس یہ اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ پاکستان آئی بینک سوسائٹی ہسپتال امراضِ چشم میں مفت علاج کے لیے کئی عشروں سے مصروف ہے۔ موتیا کے آپریشن قرنیوں کی تبدیلی سری لنکا امریکہ سے عطیہ کی گئی آنکھوں سے بصارت کی بحالی کے ساتھ اس ہسپتال نے ڈائیلاسز، گٹکا کینسر چھاتی کے کینسر کے علاج بھی شروع کر دیئے ہیں۔ بی اے ایس ایف کے سابق مینجنگ ڈائیکٹر قاضی ساجد علی نے اپنی زندگی اس کارِ خیر کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس ہپستال نے اعترافِ خدمت اعزاز کیلئے جیسمین پطرس کا نام دیا اس طرح ایک اور غیر مسلم ہم وطن کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

نرس جیسمین پطرس خدمتِ خلق میں دن رات مصروف

تحریر: جہاں آراء

نرسنگ کا شعبہ انتہائی مقدس اور علم، ہنر اور عزم و حوصلہ کا امتزاج ہے۔ اور جو لوگ اس مقدس پیشے سے منسلک ہو کر خلوص دل سے اپنے فرایض منصبی ادا کرتے ہیں وہ یقینا قابل فخر اور خراج تحسین کے مستحق ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں مریض کی دیکھ بھال کا سارا انحصار نرس پر ہوتا ہے۔ اسی مقدس پیشے سے تعلق رکھنے والی نرس جیسمین پطرس ہیں جو پچھلے پانچ سالوں سے پاکستان آئی بینک سوسائٹی سے منسلک ہیں۔ جیسمین اپنی انتھک محنت اور لگن کی وجہ سے ایک خاص مقام اور اہمیت کی حامل ہیں اور قریباً پچاس ہزار آپریشنوں میں ساتھ دے چکی ہیں۔

جیسمین پطرس صاحبہ کی پیدائش پنجاب کے شہر اوکاڑہ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی اوکاڑہ ہی سے حاصل کی۔ پھر میٹرک کی تعلیم کے لیے اپنے بڑے بھائی کے پاس حیدر آباد آ گئیں۔ بعد ازاں بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری گورنمنٹ کالج برائے خواتین ناظم آباد سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے ان کا رجحان نرسنگ کے شعبے کی جانب تھا۔ ان کی دو بڑی بہنیں بھی اسی شعبے سے منسلک تھیں اور جیسمین بھی انسانی خدمت کے کسی -+شعبے سے اپنا تعلق جوڑنا چاہتی تھیں۔

اسی لیے جے پی ایم سی (JPMC) سے نرسنگ کی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ مگر چار سال کی پیشہ وارانہ زندگی کے بعد شادی ہو گئی اور گھریلو ذمہ داریوں کے باعث انہیں اپنے پیشے سے

جناح پوسٹ میڈیکل کالج سے نرسنگ کی تعلیم اور تربیت

دوری اختیار کرنی پڑی۔ ۲۰۰۳ میں اپنی ساس کی آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں پاکستان آئی بینک سوسائٹی آنا ہوا جہاں محمد حنیف شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے اصرار اور گھر والوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے دوبارہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ جیسمین کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں گھر والوں کی جانب سے کبھی کسی قسم کی روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ گھر اور کام کو ایک ساتھ لے کر چلنا اگرچہ بہت مشکل تھا لیکن سب گھر والوں اور بچوں نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ جیسمین زندگی کا مقصد انسانی خدمت کو قرار دیتی ہیں۔

جیسمین صاحبہ کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف خدمت خلق ہے اور اس کے لیے وہ دن رات ایک کر رہی ہیں شادی شدہ زندگی گزارنے کے باوجود کبھی انہوں نے اپنے گھر اور اس کے مسائل کو اپنے شعبے کے آڑے آنے نہیں دیا ہے یہی ان کی زندگی کی کامیابی کا راز ہے۔ کچھ عرصہ قبل ان کے شوہر امراض قلب کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار گئے لیکن جیسمین نے زندگی سے ہار نہیں مانی اور اکیلے ہی اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں بھی بخوبی انجام دیتی رہیں۔

مریضوں کی دعائیں ان کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی

ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ ان کے مریض ان سے بہت زیادہ خوش ہو کر جاتے ہیں اور ان کے لیے بہت دعائیں کرتے ہیں۔ کبھی مریضوں کی بڑھتی تعداد کی وجہ سے ان کی ذمہ داریاں دہری ہو جاتی ہیں اور دن رات کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ کبھی ہمت نہیں ہارتی اور بلا رنگ و نسل مریضوں کی خدمت کے لیے ہمہ وقت حاضر رہتی ہیں۔

اور وہ آئندہ بھی اسی طرح سے لگن و ایمانداری سچائی سے کام کرنے کا عزم رکھتی ہیں اور نسل نو کو بھی یہی ترغیب دیتی ہیں کہ اپنے کام کو فرض سمجھ کر ادا کریں۔ اگر تمام انسان ایمانداری، وقت کی پابندی اور سلیقہ شعاری سے اپنے امور انجام دیتے رہیں تو زندگی میں ہمیشہ کامیابیاں حاصل ہوں گی۔

کرمین پاریکھ اعترافِ خدمت اعزاز 2025

اطراف نے اعترافِ خدمت اعزاز میں ہمیشہ کوشش کی ہے کہ معزز خواتین کا انتخاب ،بلا امتیاز مذہب ،زبان ،نسل کیا جائے غیر مسلم ہم وطنوں کی خدمات کا بھی اعتراف کیا جائے۔ہندو مسیحی برادری کی خواتین بھی یہ اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔آنجہانی بہرام اواری اطراف کے سرپرست تھے۔اُن کے صاحبزادے ڈنشا سے ہم نے درخواست کی تھی کہ کسی پارسی خاتون کو اس اعزاز کیلئے متعارف کروائیں۔اُن کی مہربانی کہ ماہرِ تعلیم کرمین پاریکھ سے ہمارا رابطہ کروایا جن کی 27 سالہ تدریسی خدمات اس اعزاز کی یقینی طور پر حق دار ہیں۔جہاں آراء نے اس عظیم غیر مسلم پاکستانی سے گفتگو کی۔اُن کی تعلیمی صلاحیتوں اپنی کمیونٹی اور پاکستان کی خدمات کا جائزہ لیا۔

پارسی ہم وطن کرمین پاریکھ 27 سال سے شعبۂ تدریس سے وابستہ

تحریر: جہاں آراء

محترمہ کرمین پاریکھ سدھوا کا تعلق شعبہ تعلیم وتدریس سے ہے۔اور اس شعبہ میں آپ تقریباً ۲۷ سال سے اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔اردو، انگریزی، گجراتی اور پنجابی زبانوں پر عبور رکھنے والی کرمین پاریکھ لاہور میں پیدا ہوئیں اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔آپ کے والد جسٹس رستم سہراب سدھوا لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے جو کہ بعد میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔آپ کے والد ایک بڑے اسکالر اور ادیب بھی تھے۔جنہوں نے پنجاب ہائی کورٹ کی تاریخ اور اور ڈسٹرکٹ گرینڈ لاج پر کتابیں لکھیں۔

آپ کی والدہ بھی ایک عظیم سماجی کارکن تھیں جنہوں نے عوامی خدمات کرنے کے ساتھ ساتھ لاہور میں زرتشتی مذہب کی کلاسوں میں رضا کارانہ خدمات انجام دیں۔لاہور سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کرمین پاریکھ لندن یونیورسٹی چلی گئیں اور وہاں سے شہری ترقی کی منصوبہ بندی(Urban Development planning) میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔تعلیم کے علاوہ سیر و سیاحت اور مصوری بھی آپ کی دلچسپی کے خاص شعبہ جات ہیں۔

والد سپریم کورٹ کے جج اسکالر اور ادیب

آپ نے نیشنل انجینئر نگ سروس پاکستان (لاہور) (NESPAK) میں بطور آرکیٹیکٹ اپنی خدمات انجام دیں۔بعد ازاں رشتہ ازدواج سے منسلک ہونے کے بعد اپنا تبادلہ کراچی کروالیا۔یہاں ان کی زندگی نے ایک مختلف موڑ لیا۔اپنے تین چھوٹے

بچوں کی بہتر پرورش اور دیکھ بھال کی غرض اپنے آرکٹیکچر کے شعبے کا خیر باد کہتے ہوئے کرمین پاریکھ نے اپنی ایک دوست کے پری پرائمری کمیونٹی اسکول میں بطور استاد پڑھانا شروع کیا۔

لیکن کرمین پاریکھ اپنے مستقبل سے مایوس نہیں تھیں۔ایک کہاوت ہے کہ Never Say Never اسی کہاوت نے کرمین پاریکھ کو ثابت قدم رکھا۔کیونکہ انسان کی زندگی

150 سال پرانے زرتشتی کمیونٹی اسکول کی 2005 سے پرنسپل

میں بہتری کے امکانات کے لیے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔اسی لئے مستقبل کے بارے میں قطعی بیانات دینے سے گریز کرنا چاہیئے۔کیونکہ مستقبل میں کچھ بھی ہوسکتا ہے اور حالات بدل سکتے ہیں۔کرمین پاریکھ صاحبہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، جب ان کے ایک ساتھی نے مقامی یونیورسٹی میں فن تعمیر کی تاریخ پڑھانے کے لیے ان سے رابطہ کیا تو اس وقت تو انہیں لگا کہ وہ یہ مضمون نہیں پڑھا سکتیں۔اپنی اس کمی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے بوہرہ کمیونٹی کے ایک اسکول میں دس سال صرف کئے اور مطلوبہ مضمون اور تعلیم میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تدریسی مہارتیں بھی حاصل کیں۔جس کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اب وہ اچھی طرح سے تربیت یافتہ ہیں اور کسی بھی بڑے تعلیمی ادارے میں تدریس کے

آرکی ٹیکچر کے شعبے کو خیرباد۔ تدریس سے عشق

آپ نے اس تعلیمی ادارے میں بطور پرنسپل کے ایڈوائزر کے طور پر اپنی خدمات انجام دیں اور اپنی محنت اور لگن کی بنا پر ۲۰۰۵ میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ آپ نے یہ عہدہ سنبھالنے کے بعد اسکول کی بہتری کے لئے کئی اہم اقدامات کیے۔ نصاب تبدیل کیا، نئے عملے کی خدمات حاصل کیں، کیمبرج بورڈ آف ایگزامینیشن متعارف کرایا، فرایض انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہاں کا انتظام بھی سنبھال سکتی

بین الاقوامی مذاکروں میں مقالے پڑھے۔ سندھ نصاب کونسل کی رکن

ہیں۔ اور ایسا ہی ہوا بھی کیونکہ اب آپ کو ۱۵۰ سال پرانے زرتشتی کمیونٹی اسکول، بائی ور بائی جی سوپری والا پارسی ہائی اسکول کراچی میں شمولیت کی دعوت دی گئی جو آپ نے خوشی خوشی قبول کی۔ ابتدا میں مقامی امتحانی بورڈ کو آغا خان امتحانی بورڈ میں تبدیل کیا اور اساتذہ کے لئے متعدد تربیتی ورکشاپس کا انعقاد بھی کیا۔ ۲۰۰۵ سے اسکول کا انتظام کرمین پاریکھ صاحبہ کے ہاتھ میں ہے جو انتہائی کامیابی کے

اپنی پارسی کمیونٹی کی خدمت کیلئے ہر لمحہ مستعد پاکستان کی دردمند

ساتھ اس کو چلا رہی ہیں ہیں ان کی دن رات کی انتھک محنت کی وجہ سے اسکول نے ترقی کی مزید کئی منازل طے کی ہیں اور کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے بین الاقوامی سمپوزیم میں مقالے پڑھے اور آپ ٹی آر سی (ٹیچرز ریسورس سینٹر) کے بورڈ میں بھی اپنی خدمات انجام دے چکی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ سندھ نصاب کونسل کی رکن ہیں اور متعدد ٹیچرز کانفرنسز میں شامل رہ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے اسکول میں کئی ہم نصابی سرگرمیاں متعارف کروائی ہیں جیسے کہ کلب، سوسائٹیز، ڈرامہ فیسٹیول، کنسرٹ، تقریر وغیرہ۔ آپ متعدد تربیتی کورس کر چکی ہیں اور کئی تعریفی اسناد اپنے نام کر چکی ہیں۔ آپ کی انتھک محنت اور کاوشوں سے اب بائی ور بائی جی سوپری والا پارسی ہائی اسکول (BVS) کو پاکستان کے دس بہترین اسکولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۱۹۹۴ میں کرمین پاریکھ نے سماجی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اپنی والدہ کی پیروی کی اور KZBM (کراچی زرتشتی بنو منڈل) میں شمولیت اختیار کی اور اس کی فلاحی سب کمیٹی اور پھر ایجوکیشن سب کمیٹی میں معاونت فراہم کی۔ ۲۰۱۴ میں وہ KZBM کی صدر منتخب ہوئیں اور آج تک کمیونٹی کی خدمت کر رہی ہیں اور ان تمام عظیم خواتین کے نقش قدم پر چل رہی ہیں جنہوں نے اسے آگے بڑھایا۔ بے شک کرمین پاریکھ صاحبہ ہمارے ملک کی تمام خواتین اور خاص کر نسل نو کے لئے مشعل راہ ہیں۔

پروفیسر نجیبہ عارف اعترافِ خدمت اعزاز 2025

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف اکادمی ادبیات پاکستان کی پہلی خاتون سربراہ ہیں۔اپنی تخلیقی صلاحیتوں تحقیقی استعداد اور سماجی ذوق و شوق کے تناظر میں یہ منصب ان کا حق بنتا تھا۔شعبۂ تدریس سے وابستگی اُن کا غرور رہی ہے۔اطراف کی اعترافِ خدمت اعزاز کمیٹی نے ضروری جانا کہ اس عظیم علمی مسند پر پہلی بار کسی خاتون کی رونق افروزی اطراف کی پذیرائی کی حق دار ہے۔ہمیں مسرت ہے کہ پروفیسر نجیبہ عارف نے ہماری درخواست قبول کی اطراف کی مستقل قلمی معاون جہاں آراء نے اُن سے ای میل پر سوالات کے جوابات حاصل کئے۔وہ یقیناً ایک کامیاب صدر نشیں رہیں گی۔نئی نسل کے لکھنے والوں کیلئے اُن کا رائٹرز ہاؤس میں قیام اور اجلاسوں کا سلسلہ اطراف پہلے ہی لائقِ تحسین قرار دے چکا ہے۔اطراف کی دلی دعا ہے کہ چیرپسن اکادمی ادبیات پاکستان کی سربراہی سے وہ اُردو سمیت ساری پاکستانی زبانوں پنجابی، سرائیکی، سندھی، پشتو، بلوچی، کشمیری اور بلتی ادب کو فروغ دے سکیں۔اور ان زبانوں کے اعلیٰ ادب کو انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کروا کے بین الاقوامی سطح پر متعارف کروائیں۔

شاعرہ، افسانہ نگار، پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی پہلی خاتون چیئرپرسن

تحریر: جہاں آراء

ڈاکٹر نجیبہ عارف کو اکادمی ادبیات پاکستان کی پہلی خاتون چیئرپرسن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔آپ بنیادی طور پر اردو زبان و ادب کی معلمہ، مصنفہ، اور محققہ بھی ہیں۔آپ ملکی و غیر ملکی جامعات سے تعلیم یافتہ ہیں، اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی سربراہی سمیت تقریباً بتیس برسوں سے زائد تدریسی تجربے کی حامل ہیں۔آپ پاکستانی زبانوں کی ترویج کے لئے حکومتِ پاکستان کی جانب سے تشکیل دی گئی کئی اعلیٰ سطحی مجالس کا حصہ بھی رہی ہیں۔ڈاکٹر نجیبہ عارف ۲۴ ستمبر، ۱۹۶۴ کو خوشاب میں پیدا ہوئیں۔آپ اسلام آباد میں اپنے شریک حیات محمد عارف جمیل اور بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔آپ کے والدین حیات نہیں ہیں۔والدہ صاحب کتاب ہیں، جنھوں نے پچاسی برس کی عمر میں اپنی خودنوشت جیون دھارا کے نام سے لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔آپ کے خاوند محترم محمد عارف جمیل بھی صاحب کتاب ہیں۔ان کا سفرنامہ، حاضر سائیں کے نام شائع ہو چکا ہے۔

آپ کے تعلیمی سفر میں ماسٹر آف پبلک ایڈمنسٹریشن (کانسی کا تمغہ)، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ایم اے اردو (سونے کا تمغہ)، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ ایم اے انگلش نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوجز، اسلام آباد۔ایم فل اقبالیات (سونے کا تمغہ)، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔پی ایچ ڈی اردو، ۲۰۰۳ء، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ فیلوشپ: سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز، یونی ورسٹی آف لندن، ۲۰۱۳ء شامل ہیں۔

اب تک آپ کی نظم ونثر، تراجم، تنقید و ترتیب، تحقیق و تدوین اور بچوں کے ادب پر مبنی اٹھارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جبکہ چھ زیر تدوین و طبع ہیں۔

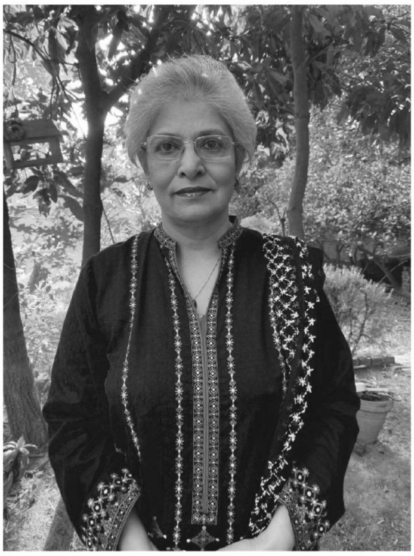

آپ کی والدہ چونکہ خود شعبہ تدریس سے وابستہ تھیں اور ادبی ذوق رکھتی تھیں۔علاوہ ازیں اردو فارسی اور عربی زبانوں سے بھی واقف تھیں۔انھوں نے بچپن ہی سے ادب کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔انتہائی کٹھن حالات میں انھوں نے تعلیم کے راستے آسان کیے اور اس معاملے میں کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔تدریس کا شعبہ ڈاکٹر صاحبہ کا ذاتی انتخاب تھا۔بارہا مالی اعتبار سے بہتر دیگر شعبہ جات میں جانے کے امکانات پیدا ہوئے مگر آپ نے ان سب سے گریز کرتے ہوئے ادب کی تدریس کو ترجیح دی۔اس ضمن میں آپ کا کہنا ہے کہ ”میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایسا شعبہ ہے جس کے ذریعے سماج میں دیرپا اثرات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔خود مجھے ایک دو ایسے استاد ملے جنھوں نے میری شخصیت کی

آذربائیجان کے سفیر کے ساتھ مفاہمتی یادداشت پر دستخط کے بعد

سکتے ہیں۔ خود مجھے ایک دو ایسے استاد ملے جنھوں نے میری شخصیت کی تراش خراش میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک طرح کا اخلاقی قرض ہے اور مجھے بھی اسی روش کو اپنانا چاہیے"۔

بطور ادیبہ ڈاکٹر صاحبہ نے شاعری سے آغاز کیا تھا پھر جلد ہی فکشن کی طرف آ گئیں۔ پہلا افسانہ، جو آپ نے آٹھویں جماعت میں لکھا تھا، خواتین کے ایک ماہنامہ میں شائع ہوا اور اس پر دو سو روپے انعام بھی ملا۔ مگر شاعری بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ آپ کی پہلی غزل مجلہ فنون میں شائع ہوئی تھی۔ آپ کی ایک کتاب "راگنی کی کھوج میں" روحانی تلاش کی داستان پر مبنی ہے جسے ہمارے اہم معاصر نقاد ناول بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ مختصر سفر نامے بھی لکھے ہیں جو مختلف رسائل وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ تنقید اور تحقیق سے دلچسپی یونی ورسٹی کی ملازمت کے دوران پیدا ہوئی اور اس ضمن میں بالخصوص آرکائیول ریسرچ یا نادر مخطوطات کی دریافت اور ترتیب و تدوین آپ کی دلچسپی کا خاص مظہر رہے۔ پوسٹ ڈوکٹورل ریسرچ کے دوران آپ نے لندن یونی ورسٹی، برٹش لائبریری، بوڈلیئن لائبریری اور نیشنل لائبریری اوف سکاٹ لینڈ کے علاوہ چند دیگر یورپی ممالک کے کتب خانوں کا جائزہ لے کر اردو اور فارسی کے کئی قدیم مخطوطات کی نقل حاصل کی ا۔ اس کام میں ڈاکٹر صاحبہ کو خاص طور پر بہت لطف اور ذہنی تسکین حاصل ہوئی۔

زمانۂ طالب علمی میں آپ محض کمرۂ جماعت میں محدود طرزِ تعلیم کا شکار نہیں ہوئیں اور انتہائی پس ماندہ چھوٹے شہروں کے سرکاری سکولوں میں پڑھنے کے باوجود ہم نصابی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کی۔ اس حوالے سے آپ کو پنجاب بھر کے مختلف شہروں میں جانے اور مقابلوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ ہائی سکول میں تقاریر، بیت بازی، تحت اللفظ شعر خوانی، ڈرامے، ٹیبلو اور سپورٹس کی دنیا میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ کالج میں داخلے کے بعد مشاعرے بھی آپ کی مصروفیت میں شامل ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا ہے کہ گھر اور کام کو ساتھ لے کر چلنا یقیناً مشکل ہے۔ والدین ہی نہیں بلکہ آپ کے شریک حیات نے بھی ہر طرح سے معاونت فراہم کی۔ شادی کے بعد پی ایچ ڈی اور ایم اے انگلش ان کی مدد سے ہی ممکن ہوا لیکن ان سب باتوں کے باوجود، گھر اور پروفیشن کو ساتھ ساتھ چلانا آسان نہیں ہوتا۔ آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا یونی ورسٹی کی ملازمت کے دوران کرنا پڑا جہاں ماحول میں سازشیں، غیر اخلاقی رویے، منافقت اور میرٹ کی بے حرمتی کا رویہ عام دیکھنے کو ملا۔ اس ماحول نے نہ صرف ڈاکٹر صاحبہ کو ذہنی طور پر پریشان کیا بلکہ اپنے تعلیمی نظام سے مایوس بھی کر دیا

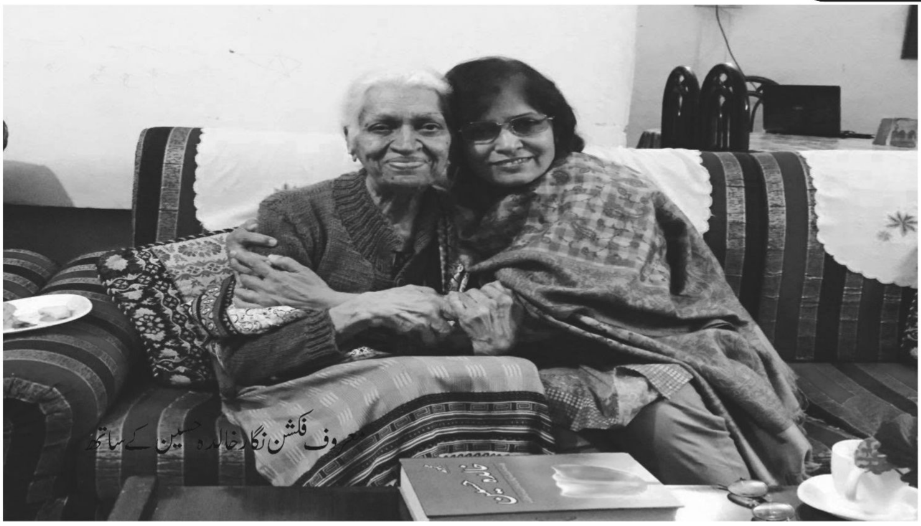

معروف فکشن نگار خالدہ حسین کے ساتھ

۔آپ کے مطابق جو تعلیمی نظام انسان کے کردار اور اخلاق کی تربیت پر توجہ نہیں دیتا، وہ ناقص اور ادھورا ہے۔ محض ڈگری کا کاغذ علم کی ضمانت نہیں۔ علم وہ ہے جو انسان کے کردار اور رویے میں نظر آئے۔ بد قسمتی سے اس پہلو پر ہم نے بالکل توجہ نہیں دی اور ادھورے انسان سماج کا حصہ بنا دیے۔

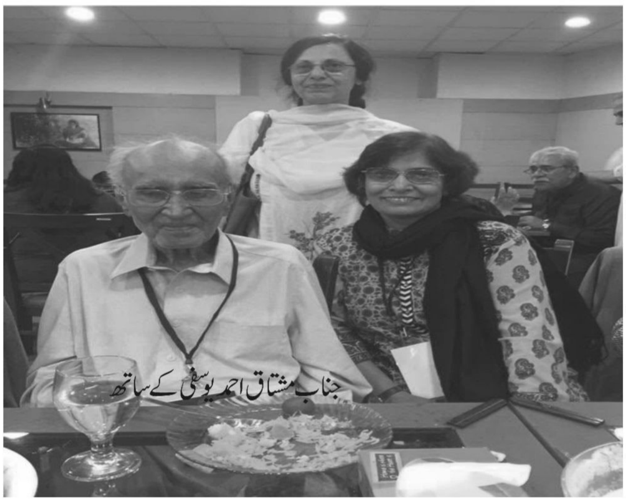

جناب مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ

ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا ہے کہ" اکادمی ادبیات پاکستان کی صدر نشیں بننے کا تجربہ ان کے لئے سب سے زیادہ معنی خیز تھا کیوں کہ میں نے کبھی اس عہدے کے لیے خواہش یا منصوبہ بندی نہیں کی تھی اور آخر تک مجھے یقین نہیں تھا کہ مجھے منتخب کر لیا جائے گا۔ ہمیشہ یہی سنتے تھے کہ

جناب اسد محمد خان کو تاحیات کارکردگی کا ایوارڈ دیتے ہوئے

لیکن میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ میری والدہ کی دعا کے نتیجے میں ملا ہے۔ زیادہ معنی خیز اس لیے ہے کہ میرا تعلق عوام کے طبقے سے ہے۔ اس طبقے کے افراد اگر دیانت داری اور محنت کے نتیجے میں کسی بڑے منصب تک پہنچتے ہیں تو یہ صرف ان کی ذات کے لیے نہیں بلکہ پورے سماج کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے۔ میں بھی سمجھتی ہوں کہ میرا یہاں تک پہنچنا میرے طبقے کے افراد کے لیے ایک مثبت پیغام ہے"۔

نسل نو کے لئے آپ کا پیغام ہے کہ "نسل نو کے لیے بہت ضروری ہے کہ اپنی جڑوں سے، اپنی روایت سے رشتہ برقرار رکھے ورنہ اپنی شناخت کھو بیٹھے گی اور اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جائے گی۔ لڑکیوں کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ عورت اس دنیا کا ماحول بناتی ہے۔ وہ جو چاہے کرے، لیکن اپنی اس ذمہ داری کو ہمیشہ پیش نظر رکھے ورنہ دنیا بکھر جائے گی۔ گھر سماج کی اکائی ہے۔ فکر معاش اہم ہے مگر گھر کا پرسکون ماحول بھی بہت اہم ہے۔ اسی ماحول میں صحت مند نسلیں پروان چڑھ سکتی ہیں۔ یہ انسان ہونے کے ناتے، مرد اور عورت دونوں کی ذمہ داری ہے کہ ایک ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی طور پر صحت مند نسل کو پروان چڑھائیں۔ اس کے لیے ایک پرسکون اور محبت بھرا ماحول چاہیے۔ مرد اور عورت دونوں کو اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے"۔

بہن نوشابہ ظفر میر اور بھائی حیدر علی میر کے ساتھ، امریکہ میں۔

شوہر محمد عارف جمیل، بیٹی مومنہ عارف اور بیٹے محمد بن عارف کے ساتھ!

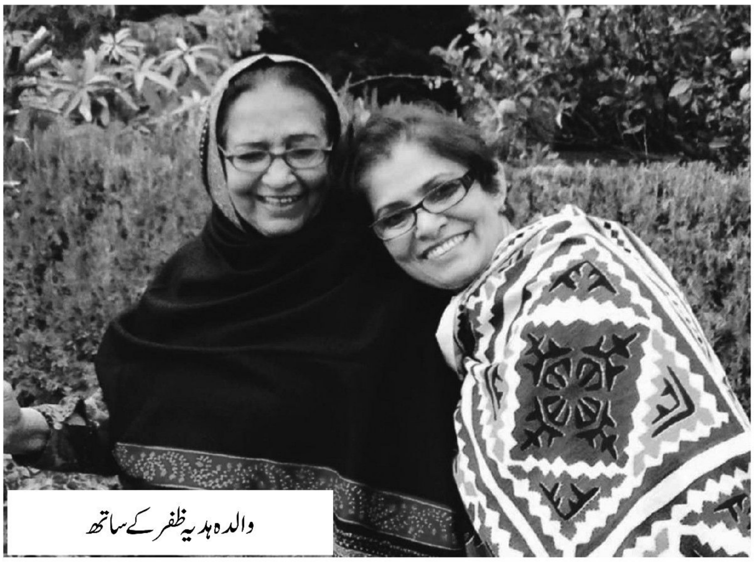

والدہ ہدیہ ظفر کے ساتھ

"بلوچستان آج کل پاکستان اور عالمی طور پر خبروں کا موضوع ہے۔بڑی الم ناک خبریں آ رہی ہیں۔ایسے میں ہم بلوچستان کے ایک بیٹے عامر معانؔ کی دردمندانہ تحریر قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔ جس میں بڑے دلنشیں انداز میں بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت معدنیات کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔یقیناً اس تحریر سے آپ بلوچستان کے درد سے آگاہ ہو جائیں گے۔"

میں پاکستان کا امیر ترین پسماندہ صوبہ ہوں

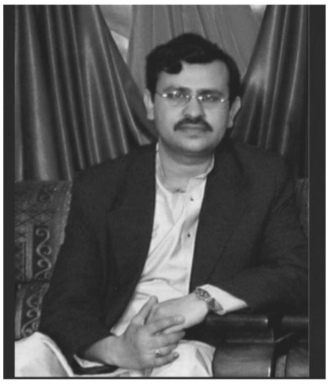

جناب عامر مُعانؔ

میں پاکستان کا امیر ترین پسماندہ صوبہ ہوں۔ یہ سطر پڑھ کر حیرت زدہ بالکل نہ ہو جایئے گا۔ جی بالکل، آپ نے درست ہی پڑھا ہے میں مملکت خداداد پاکستان کا امیر ترین پسماندہ صوبہ ہوں۔ آپ دنیا کا نقشہ غور سے دیکھیں میں رقبے کے لحاظ سے پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ایک اعلی اور ممتاز مقام عطاء کرتا وہ صوبہ ہوں جو رقبے کے لحاظ سے دنیا کے بہت سے ممالک سے زیادہ وسیع و عریض ہے میں اس دنیا کی خوبصورتی میں موجود وہ خطہ ہوں جو اپنے اندر چاروں موسموں کی خوشبو مع خصوصیات کے رکھتا ہوں اور دنیا کے جنت نظیر مقامات میں اپنی واضح شناخت رکھتا ہوں۔ میری دھرتی اپنا سینہ چاک کر کے دنیا کے بہترین انواع واقسام کے پھل پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اور جب بہترین پھلوں کا ذکر آتا ہے تو میرے نام پر آنکھیں بند کر کے اعتبار یہ یقین ہے کہ میں دنیا کے لذیذ ترین ذائقے کا احساس ہوں۔ میرے سینے پر کھڑے یہ بلند و بانگ پہاڑ اپنے اندر معدنیات کی دولت سے مالا مال ہیں اور میری سربلندی کی نوید دنیا کو سناتے ہیں کہ ہم ہر دور میں خوشحالی کا نشان ہیں ۔ میرے ان پہاڑوں سے نکلے بیش قیمت سنگ مرمر کے دلکش خوبصورت پتھر بڑے بڑے محلوں کو رونق بخش کر میری موجودگی کی داستان رقم کرتے ہیں۔ میرا کوئلہ میرا فخر ہے جو کاروبار زندگی میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے اور ہزاروں پہیئے رواں رکھے ہوئے ہے۔ میں اپنے اندر سونے کے ذخائر بھی رکھتا ہوں اور جواہرات بھی جن کی کھوج ساری دنیا کو میری تعریف سنہری حروف سے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ میں ہی ہوں جو ایک عرصہ دراز سے ملک کی معدنی گیس کے ایک بڑے حصے کو پورا کرتا ہوا اس ملک کی ترقی میں اپنا حصہ بھرپور انداز میں دیتا آ رہا ہوں۔ میں ایک ایسی دنیا میں جہاں کئی ممالک کو سمندر نہیں نصیب اور 1 پورٹ بھی موجود نہیں ہے، یہ میں ہی ہوں جو ایک وسیع سمندر کا نہ صرف مالک ہوں بلکہ اپنے اندر کئی پورٹس رکھتا ہوں جو میری لافانی عظمت کی دلیل ہیں کہ میں ماضی حال اور مستقبل ہر دور میں ایک شان رکھتا ہوں۔ میں اس دنیا کے مختلف ممالک کو آپس میں ملاتا ہوں اور ان کے درمیان محبت سے بھرا ہنستا مسکراتا ایک رشتہ قائم کر کے تجارت کے دروازے کھول دیتا ہوں میں معیشت کا پہیہ رواں رکھنے میں صدیوں سے اپنا کردار بخوبی نبھا رہا ہوں اور نبھاتا رہوں گا یوں جب میں اپنی سرحدوں کی بانہیں کھولتا ہوں تو ساری دنیا میری گزرگاہ بن جاتی ہے۔ میں نسلوں کا امین ہوں۔ یہ میں ہوں جو اپنے اندر موجود تمام اقوام کو نہ صرف اپنا بنا لیتا ہوں بلکہ ان کو اپنے بچوں کی طرح پالتا ہوں۔ مجھ پر بسنے والی اقوام کی تعداد پورے پاکستان میں بسنے والی اقوام کی تعداد کے برابر ہے یعنی میں پورے پاکستان کی شناخت ہوں۔ پاکستان کے ہر خطے میں بسنے والوں کو میں نے اپنے اندر پیار محبت سے جگہ دی ہے نہ صرف جگہ بلکہ ان کو اپنی شناخت دی ہے۔ لیکن میں پھر بھی پسماندہ ہوں، کیوں؟؟ نجانے کیوں یہ سب مجھ سے فائدہ اٹھانے والے مجھے نظر انداز کرتے آ رہے ہیں؟؟ کیا وجہ ہے کہ ملک کے تمام علاقوں میں میری گیس پر پکی روٹی کھانے والوں کو میرا کرب نظر نہیں آتا؟؟ کیا وجہ ہے کہ میرے پہاڑوں سے سونے جواہرات لے جانے کے خواب دیکھنے والوں کو میرا زخم زخم سینہ نظر نہیں آتا؟ کیا وجہ ہے کہ میرے ذریعے دنیا تک تجارت پہنچانے والوں کو میرے بے روزگار بچے نظر نہیں آتے؟؟ میرے سنگ مرمر سے اپنے محلوں کی رونقیں بڑھانے والوں کو میری پسماندگی نظر نہیں آتی؟؟ میں سب کو بہت کچھ دے کر بھی تہی دامن کیوں؟؟ میں نے تو اپنا سینہ محبت سے سب کے لئے کھولا ہوا ہے اور اپنے میں موجود تمام فوائد سے اس ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا ہے تو پھر کیا وجہ ہے ارباب اختیار نے میری طرف سے آنکھیں کیوں موند رکھی ہیں؟؟ میں نے اس ملک کی ترقی کے لئے حتی المقدور کوشش کی ہے اور ہر ہر شعبہ ہائے زندگی کو نامور ہیرے جیسے افراد دیئے ہیں کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو میرے ان سپوتوں نے اس ملک کی ترقی کے لئے اپنا تن من دھن سب قربان کیا اور اس کی عظمت کی خاطر صرف پسینہ ہی نہیں خون بھی پسینے کی طرح بہا کر میری اس ملک کے ساتھ وفا کی داستانیں رقم کی ہیں اور ملک کے روشن مستقبل میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے اور ہمیشہ ادا کرتے رہیں گے۔ لیکن کیا ارباب اختیار صرف یہ کہہ کر جان چھڑا سکتے ہیں کہ میں ایک پسماندہ صوبہ ہوں؟؟ اگر ہوں تو کیوں ہوں جب کہ میں وہ سب وسائل رکھتا ہوں جن کے ذریعے کئی ممالک دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہیں۔ تو پھر یہ میرا حق ہے کہ پوچھوں کہ مجھ کو پسماندہ کس نے رکھا ہے؟؟ کس نے میرے بارے میں سب کو یہ رائے قائم کرنے کا حق دیا ہے کہ اس کی پسماندگی اس کی اپنی وجہ سے ہے؟؟ میرے وسائل استعمال کرتے ہوئے جب سب سانجھا ہے تو اس کو لگاتے ہوئے میں سانجھا کیوں نہیں ہوں؟؟ میں کوئی مطالبہ نہیں کرتا کیوں کہ یہ میرا حق ہے۔ ہمیشہ سے دنیا کی ترقی کا راز یہی ہے کہ سب کو اکھٹا ساتھ لے کر چلو اور جب سب ایک جیسے نکھرے نکھرے نظر آئیں گے تو دنیا کی نظر میں ملک کی خوبصورتی میں بہت ذیادہ اضافہ ہوگا۔ میں کسی کو اعداد کے کھیل میں الجھانا نہیں چاہتا کہ اس کے لئے اتنا کچھ تحریر ہو چکا ہے کہ ان پر صرف بحث کر کے ان کو بھلا دیا جاتا ہے اور ویسے بھی جو بات عام آدمی تک نہ پہنچ سکے وہ اعداد کے کھیل میں غائب ہو جاتی ہے کیوں کہ عام آدمی دو اور دو چار جانتا ہے جبکہ دفاتر میں اس کو بائیس بنانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر کسی کے پاس ہر دور میں سیدھا سا راستہ تحقیق ہے اور آج کل کی اس ترقی یافتہ دنیا میں آپ صرف گوگل پر اپنا قیمتی وقت میری محبت میں لگا کر سرچ کریں اور میرا مقدمہ آپ کے سامنے کھلی کتاب کی طرح کھل کر سامنے آ جائے گا۔ میری ترقی، میرے بچوں کا روزگار اور ایک عمدہ و آسان زندگی میرا حق ہے، اس کے لئے ذمہ داران کی سوچ کا وسیع ہونا اور میری وفا کا بدلہ وفا سے دینا شرط اولین ہے۔ جیسے میں نے اپنی بانہیں وسیع کر کے سب کو اپنے اندر سمویا ہے اسی طرح سب مجھے بھی اپنے دل میں جگہ دیں۔ میری ترقی سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے مجھ پر موجود بڑے بڑے پروگرام مزید یہ نوید سناتے ہیں کہ ماضی اور حال کی طرح میرا مستقبل بھی نہایت شاندار اور عظمت والا ہے۔

عفت سلطانہ۔اعتراف خدمت اعزاز 2025

اطراف کی ایک خوش آئند روایت اعتراف خدمت اعزاز رہی ہے۔ مارچ میں عورت نمبر اور پاکستان کی چند حقیقی خدمات انجام دیتی خواتین کا انتخاب۔ اسکردو میں 30 سال تک مصروف تدریس عفت سلطانہ اردو کی عاشق ہیں۔ان کے شاگرد پورے پاکستان اور بیرون پاکستان موجود ہیں۔ان کے مرحوم خاوند سر نجمی اسکردو کی متحرم ہستیوں میں سے تھے کئی برس اسکردو میں علم کی شمع روشن رکھی۔جہاں آراء نے اعترافِ خدمت اعزاز 2025 کی خوش نصیب عفت سلطانہ سے گفتگو کی۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے نوازیئے۔

کراچی کی بیٹی 30 سال تک اسکردو میں مصروفِ تدریس رہی

اعزاز یافتہ عفت سلطانہ سے جہاں آراء کی خصوصی گفتگو

محترمہ عفت سلطانہ کا شمار پاکستان کی بہت باہمت خواتین میں ہوتا ہے۔آپ کا تعلق شعبہ تعلیم سے ہے۔آپ تقریبا ۳۰ سال سے زائد عرصے تک نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہیں ۔آپ کراچی میں پیدا ہوئیں اور جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ہیں۔ایف ایس سی کی تعلیم گورنمنٹ کالج برائے خواتین ناظم آباد سے حاصل کرنے کے بعد جامعہ کراچی سے بی ایس آنرز اور ایم ایس سی اور بی ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔بعدازاں شعبہ تدریس سے وابستہ ہوئیں۔اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی مقدس منصب کی انجام دہی کے لئے صرف کردیا۔آپ کے مطابق خواتین کے لیے سب سے باعزت شعبہ تعلیم ہی ہے۔

محترمہ عفت سلطانہ کا اعزاز یہ ہے کہ آپ نے مسلسل ۳۰ سال سکردو میں اس قدر لگن اور جانفشانی کے ساتھ پڑھایا کہ موسم کی شدت اور سفر کی دقت بھی کبھی آپ کے منصب فرائضی کی تکمیل میں آڑے نہیں آسکی۔اگرچہ اسکردو میں سردی کے حوالے سے مسائل ہوتے تھے بجلی کا بہت بحران ہوتا ہے۔سردی کی شدت اور موسم کی خرابی کے باعث اکثر روڈ بند ہوجانے اور فلائٹ کے ملتوی ہونے جیسے مسائل بھی درپیش رہتے تھے۔اور کبھی تو صورت حال اتنی

اسکردو کے طالب علم محنتی اور عزت کرنے والے

خراب ہوجاتی کہ باقی دنیا سے رابطہ بالکل منقطع ہوجاتا تھا۔لیکن محترمہ عفت سلطانہ کا رابطہ اپنے طالبعلموں سے کبھی منقطع نہ ہوتا ۔اس کی بڑی وجہ آپ کی دل جمعی اور ثابت قدمی تھی ۔اس سفر میں آپ کے گھر والوں نے بھی آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔لیکن اب اسکردو کے حالات پہلے سے کافی بہتر ہوچکے ہیں۔

عفت سلطانہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ اسکردو میں پڑھانے کا تجربہ ان کی زندگی کا ایک یادگار تجربہ ہے۔وہاں کے طالب علم بہت محنتی اور عزت کرنے والے ہیں۔وہ اپنے بزرگوں کی بھی تعظیم کرتے ہیں اور مہمان نواز بھی ہیں۔آپ کے مطابق تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے جو طالب علموں اور اساتذہ دونوں کو سوچ کے نئے زاویے عطا کرتا ہے۔جن کی بنیاد پرنت نئے تجربات کئے جاتے ہیں۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تدریسی عمل میں اُستاد کا کردار بڑا اہم اور بنیادی ہوتا ہے لیکن اس عمل میں طلبہ کو بھی کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ سیکھنے سکھانے کے عمل میں طالب علم یعنی سیکھنے والے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔

محترمہ عفت سلطانہ نے بتایا کہ، جب انہوں نے اسکردو میں

ملازمت اختیار کی تو اس وقت وہاں خواندگی کی شرح بہت پست تھی۔ خاص طور پر خواتین میں پڑھنے کا رجحان نہیں تھا۔ لیکن اب وہاں شرح خواندگی بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ، ’’اس بات سے بہت خوشی اور دلی تسکین ہوتی ہوتی ہے کہ ہم نے جو پودے لگائے تھے اب وہ تناور درخت بن چکے ہیں اور شکر الحمد للہ خوب پھل پھول رہے ہیں۔ یہ ہی تو زندگی کی بڑی کامیابی ہے‘‘۔

محترمہ عفت سلطانہ درس و تدریس کے علاوہ لکھنے لکھانے سے بھی خاص شغف رکھتی ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ لکھنے کے شوق کی تکمیل کے لئے کتب بینی بہت اہم ہے علاوہ ازیں مشاہدات و تجربات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں سیکھانے کے عمل میں اساتذہ اور کتب خانوں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ آپ تقریباً ۸۰ کی دہائی سے لکھ رہی ہیں۔ یہ آپ کا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ آپ کو اپنی تحریروں کی تعداد تو یاد نہیں البتہ اپنے قلمی ذوق کی تسکین کے لئے آپ مختلف ڈائجسٹوں (خواتین، شعاع، پاکیزہ اور دوشیزہ) میں کہانیاں، افسانے اور ناولٹ لکھتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ماہنامہ اطراف کے لئے بھی دلچسپ مضامین لکھتی رہتی ہیں جس پر محترم محمود شام صاحب بہت حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اور یہ ہی حوصلہ افزائی آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ، محمود شام صاحب کے ساتھ کام کرنا ایک بہترین تجربہ رہا ہے۔ سینئر لکھاری ان کی پسندیدہ شخصیات ہیں۔

عفت سلطانہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ، خواتین کے لیے گھر اور کام کو لے کر چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہمت کریں تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ، اپنے کام کا تجربہ اور پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے بڑوں اور تجربہ کار شخصیات سے مدد لی اور بہت سی کتابیں بھی پڑھیں۔ اللہ کی مدد، دعاؤں اور جدوجہد مسلسل نے انہیں زندگی کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کیا۔

حالات جیسے بھی ہوں مایوس نہ ہوں محنت جاری رکھیں

آخر میں آپ کا نسل نو کے لیے پیغام ہے کہ ’’حالات جیسے بھی ہوں مایوس نہ ہوں محنت جاری رکھیں۔

دنیا سے رابطے منقطع ہوجاتے عفت سلطانہ کے اپنے طالب علموں سے کبھی منقطع نہ ہوتے

نسیم انجم اعترافِ خدمت اعزاز 2025

"نسیم انجم۔ بہت ہی سادہ دل ملنسار اور با اصول شخصیت ہیں۔ مطالعے کی دلدادہ کتابیں اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے، افسانوں کے تین مجموعے آچکے اور پانچ ناول جو انتہائی اچھوتے موضوعات پر ہیں۔ درد مند پاکستانی ہیں روزنامہ ایکسپرس میں اپنے کالموں میں متوسط اور نادار طبقے کی مشکلات بیان کرتی ہیں۔ مثبت مقاصد پیشِ نظر رکھ کر خدمتِ خلق کرنے والی انجمنوں سے متعارف کراتی ہیں۔ اطراف نے ان کی قلم سے مسلسل وابستگی اکثریتی مخلوق کے دکھ درد پر ناول لکھنے کی وجہ سے اعترافِ خدمت اعزاز 2025 اُن کے نام کیا ہے۔"

ناول نگار۔ افسانہ نویس کالمسٹ نسیم انجم

تحریر: جہاں آراء

محترمہ نسیم انجم کا تعلق شعبہ علم و ادب سے ہے۔ آپ موجودہ دور میں اردو ادب کا ایک اہم نام ہیں۔ آپ کراچی میں پیدا ہوئی دین دار گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کے والدین نے انہیں مذہبی تعلیم کی جانب راغب کیا اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا درس دیا۔ والد صاحب اپنے اصولوں کے پابند اور دیندار انسان تھے۔ انہیں حالات زمانہ اور کچھ فطرت نے بارعب اور سخت مزاج بنا دیا تھا۔ وہ لڑکیوں کو یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھے لہذا ابتدا میں صرف مڈل تک پڑھنے کا موقع ملا۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد والد صاحب کی طرف سے حکم صادر کیا گیا کہ اب تعلیم کو خیر باد کہہ دیں یہ فیصلہ نسیم انجم صاحبہ کے لیے کسی جان لیوا فیصلے سے کم نہیں تھا۔ لہذا اپنی والدہ کے توسط سے وہ اپنے والد کو راضی کرنے میں کامیاب ہوگئی لیکن ریگولر کی بجائے پرائیویٹ پڑھنے کی اجازت ملی۔ نسیم انجم صاحبہ کا کہنا ہے کہ ان کا تعلیمی سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما گزرا ہے۔ بہت سے ایسے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا جہاں تعلیمی سفر مکمل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا جدوجہد کو اپنا عملی ہتھیار بنایا اور آخر کوشش رنگ لے آئیں اور ان کا تعلیمی سلسلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔

(نسیم انجم ، ناول نگار ، افسانہ نگار ، کالم نگار)

شادی کے بعد انہوں نے ایم اے اردو اور بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی جو درس و تدریس کے موقع پر بہت کام آئی۔

لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد صاحب نے اپنے کتب خانے میں اسلامی اور معاشرتی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی والدہ اور بڑے بھائی ادب اور شاعری سے شغف رکھتے تھے لہذا ان کی کتابوں اور لائبریری میں موجود دیگر کتابوں کے دیدہ زیب سرورق نے ان کی مکمل توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ پھر شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا جہاں کتاب نظر آئی خرید لیتی اور اسے پڑھنا لازم سمجھتی۔ بقول نسیم انجم کے وہ دن بہت اچھے تھے۔ گلی کوچوں میں لائبریریاں قائم تھیں۔ لہذا افسانے، ناول، شاعری اور تاریخی کتب ان کے مطالعے میں رہتیں۔

نسیم انجم صاحبہ کا کہنا ہے کہ، شعبہ تعلیم کے انتخاب کی وجہ ان کی ضرورت بھی تھی اور شوق بھی۔ کیونکہ ان کی ہم جماعت اور محلے کی سہیلیاں بحیثیت استاد ملازمت کرنے پر بہت زور دیتی تھی ان کا کہنا تھا کہ جب بی۔ ایڈ کیا ہے تو پھر معلمی کا پیشہ اپنانا ناگزیر ہے۔ لہذا ضرورت اور دوستوں کی فرمائش نے انہیں استاد بنایا۔

سوشل ورک کی ابتدا 2004 میں پشاور سے کی

نسیم انجم صاحبہ کی والدہ ماجدہ نے تعلیم کے حصول کے لیے ان کی بہت رہنمائی کی۔ جب باقاعدہ لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ ان کی تحریریں پڑھ کر بہت حوصلہ بڑھاتیں اور دعائیں دیتیں۔ ان کے والدہ ہی کی دعائیں رنگ لائیں اور ان کی پیاسی روح کو سیراب کیا جس کے بعد انہوں نے تحریر و تخلیق کے حوالے سے کام شروع کیا۔ آپ نے نثر کی مختلف جہتوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے افسانوں کے تین مجموعے (دھوپ چھاؤں، آج کا انسان، گلاب فن اور دوسرے افسانے)، پانچ ناول (کائنات، نرک، پتوار، آہٹ، سر بازار رقصاں) اور تنقید پر دو کتابیں (خاک میں صورتیں اور اردو

ہما بیگ ۔ اعترافِ خدمت اعزاز 2025

اعترافِ خدمت اعزز 2025 کے لیے ہما بیگ صاحبہ کا انتخاب اُن کی بے باک قلم کاری غم کو اپنی طاقت بنانے کی ہمت اور اُن کی استقامت کے حوالے سے کیا گیا۔ کراچی ہی نہیں دوسرے شہروں کے درد مند بھی اُن کے حوصلے اور برداشت کی داد دیتے ہیں۔ اُن کی کہانی اُن کی زبانی سنیئے جہاں آرا نے اُن سے کچھ سوالات کیئے اُن کے جوابات سے مرتب ایک تحریر آپ کی پیشِ خدمت ہے۔ ہما بیگ کے لیے دعا کریں۔ کہ اللّٰہ تعالیٰ اُن کے خواب حقیقت میں ڈھال دے وہ بے سہارا بیٹیوں کو اتنی ہنر مند بنا دیں کہ وہ خود اپنا سہارا بن جائیں۔

نامور سماجی کارکن باہمت ماں حوصلہ مند بیوی ہما بیگ

آتے تھے مگران میں

محترمہ ہما بیگ ہمارے ملک کی ایک نامور سماجی کارکن، شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر آپ ایک ایسی باہمت اور بلند حوصلہ خاتون ہیں کہ جن کی بلند حوصلگی پر ہر بنت حوا ناز کرتی ہے۔ آپ کے افسانوں کو ایک بہتر مثبت سوچ کے افسانے قرار دیا جاتا ہے۔

آپ کا نام ہما آصف تھا جو شادی کے بعد ہما بیگ ہوگیا۔ پیدائش کراچی میں ہوئی انٹر سائنس کرنے کے بعد بی۔ اے کیا کیوں کہ انہوں نے انٹر گورنمنٹ کالج برائے خواتین ناظم آباد سے کیا تھا اس وقت وہاں انٹر کے بعد سائنس کا شعبہ نہیں تھا اس لئے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ انٹر میں پروفیسر وحیدہ نسیم سے بوٹنی کا مضمون پڑھا۔ پروفیسر وحیدہ نسیم بے حد ذہین اور علم سے محبت کرنے والی شاعرہ اور ادیبہ تھیں ان سے آپ کے گھریلو مراسم بھی تھے۔ زمانہ کالج میں ہی ہما بیگ صاحبہ کو بزم ادب کی نائب صدر کے طور پر منتخب کیا گیا اور کالج کے میگزین کی مدیرہ بھی بنا دیا گیا۔ ہما بیگ صاحبہ کا کہنا ہے کہ اس وقت تک ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بہت شوخ اور چنچل تھیں اسی لئے ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ جاسوسی ناول اور سسپنس ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔ والدہ اور نانا ادیب اور شاعر تھے اس لیے گھر پر سب رسالے

سوشل ورک کی ابتدا 2004 میں پشاور سے کی

ان کی کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ والدہ اور بڑی بہن کا ریڈیو پاکستان سے کافی تعلق رہا اس لیے اہم شخصیات کا گھر آنا جانا رہتا تھا۔ مگر ہما بیگ کی دنیا سب سے الگ تھی۔ ان ہی دنوں خواجہ بیگم جو بزم طلبا کرتی تھیں نے انہیں کچھ پروگرام دیئے یہاں سے ان کے سماجی رابطے بننا شروع ہوئے۔ ڈراموں میں آپ کو کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی کیونکہ آپ اداکاری نہیں کر سکتی تھیں۔ 30 سال بعد جب سیما رضا نے ریڈیو پر بلایا تو وہاں آپ نے کچھ انٹرویو کئے اور اپنے لکھے ہوئے کالم پڑھے لیکن اداکاری نہیں کی۔ شادی کے بعد قلم سے رشتہ ختم ہوگیا کیونکہ آپ کے مطابق شادی کے بعد ایک لڑکی کی پہلی ذمہ داری اس کا گھر شوہر اور بچے ہوتے ہیں اس کے بعد دیگر مصروفیات ہوتی ہیں۔ ہما بیگ صاحبہ کا کہنا ہے کہ ہماری تربیت ہی ہماری صحیح پہچان کرواتی ہے کہ ہم کون ہیں؟

سماجی خدمت سے ہما بیگ صاحبہ کو ایک خاص لگاو ہے۔خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو آپ ایک اہم معاشرتی ذمہ داری سمجھتی ہیں۔ ۲۰۰۴ میں آپ پشاور میں تھیں وہیں سے سوشل ورک

کی ابتدا کی۔وہاں آپ نے خواتین کی جیل اور جیل کے پاگل خانہ اور معذور بچوں کے اسکول وغیرہ کے دورے کئے۔اور ان کے ساتھ کام کیا لیکن کبھی اپنی ان مصروفیات کو اپنی نجی اور گھریلو زندگی کے آڑے نا آنے دیا۔آپ کے کام کے اوقات مختص ہوتے تھے۔بچوں کے اسکول کالج جانے کے بعد جانا اور ان کی واپسی

خواب دس سلائی مشینوں کا اب چالیس سلائی مشینیں ہیں

سے پہلے گھر آجانا آپ کا معمول ہوتا تھا۔چونکہ آپ نے زیادہ کام سرکاری اداروں کے لیے کیا اس لیے وسائل کی کمی ہمیشہ آپ کے جذبہ خدمت کے آڑے آجاتی تھی۔اس وقت ان کے دل میں یہ ارمان پیدا ہوتا تھا کہ کاش ان کے پاس اتنے پیسے ہوں کہ وہ ۱۰ مشینیں لے کر خود ضرورت مندوں کی مدد کرسکیں ان کو پیروں پر کھڑا کرسکیں۔

ہما بیگ صاحبہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے زندگی میں دو ہی خواب دیکھے تھے ایک یہ کہ وہ ضرورت مند لڑکیوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کردیں اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ حج یا عمرہ کی ادائیگی کریں۔جب تین بیٹیوں کے بعد اللہ نے انہیں ایک بیٹا عطا فرمایا جس کا نام انہوں نے وحید رکھا تھا، تو وہ بہت خوش ہوئیں کہ ان کا محرم آگیا ہے جس کے ساتھ وہ حج کرسکیں گی۔لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔اللہ نے آپ کی پہلی خواہش تو پوری فرمائی لیکن ایک بہت ہی سخت اور جان لیوا آزمائش کے بعد۔وہ اس طرح کہ ۲۰۲۰ میں آپ کا اکلوتا بیٹا جو کہ آپ کی تین بیٹیوں کا اکلوتا بھائی بھی تھا ایک جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوگیا۔ایک ماں کے لیے بدترین خبر تھی۔بیٹے کے غم میں بیمار ہوکر دو سال بعد ہی ہما بیگ صاحبہ کے شریک زندگی بھی انہیں داغ زندگی دے گئے۔لیکن جو رب اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے وہ ہی اسے جھیلنے کا حوصلہ بھی عطا فرماتا ہے۔لہذا آپ نے بھی اپنے ٹوٹے ہوئے وجود کو رضائے الہی کے لیے خود کو سمیٹا اور بے بسی سے صبر و رضا کا سفر طے کیا۔اور یہیں سے انہوں نے سماجی خدمت کے کاموں کے لئے وقف کردیا۔

ہما بیگ کا کہنا ہے کہ انہوں نے زندگی میں کوئی کام سوچ کر نہیں کیا البتہ اللہ پاک نے خود ان کے لیے راستے بنائے اور اسی راستے پر چلنے میں ان کی مدد فرمائی۔

اس سے قبل ۲۰۰۵ کا زلزلہ بھی آپ کے لئے بہت دکھ کا باعث بنا تھا۔شادی کے بعد یہ موقع تھا جب ایک بار پھر قلم ان کے ہاتھ میں آگیا اور وہ بغیر سوچے سمجھے لکھتی رہیں۔نظم،غزل،افسانے کالم اور انٹرویوز غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ان سب کے شائع ہونے سے حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔بس یوں ہی حوصلہ بڑھتا گیا اور آپ کی پہلی کتاب نقطہ نگاہ سامنے آئی جو کہ آپ کے لکھے ہوئے کالموں پر مشتمل ہے۔دوسری کتاب باتوں سے خوشبو آئے لکھی جو کہ مختلف شعبوں کے لوگوں سے انٹرویو پر مبنی ہے۔تیسری کتاب آپ کی غزلیات پر مبنی ہے۔چوتھی کتاب افسانوں اور سچی کہانیوں کا مجموعہ ہے تماشہ میرے آگے۔ہما بیگ صاحبہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں لکھا جو مشاہدے میں آیا اس کو صفحہ قرطاس پر اتار دیا۔اور نا ہی کبھی اپنی تحریر کو خوبصورت بنانے کے لیے مشکل لفاظی کا استعمال کیا۔آسان و سادہ الفاظ میں اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔کیونکہ آراستہ پیراستہ تحریریں لگتی تو اچھی ہیں مگر مقصدیت سے دور ہوتی ہیں۔ہما بیگ کی آخری شائع ہونے والی کتاب جینا نہیں تیرے بعد ہے۔اس میں کالم،نظم اور افسانے شامل ہیں۔

ہما بیگ صاحبہ کا کہنا ہے کہ ”خود کو راضی با رضا چھوڑ کر دیکھئے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مجھے اللہ تعالی نے ایسے راستے پر چلایا جو میرے لیے بہترین ہے جو دس مشینوں کی خواہش دل میں لے کر بیٹھی تھی اللہ کے فضل سے میرے سینٹر پر 10 سے شروع ہوکر 40 سے زیادہ ہو چکی ہیں۔بیٹے اور شوہر کی موت میرے لئے سخت وقت تھا لیکن اللہ تعالی نے سلائی اور ٹریننگ سینٹر کو میرے لیے بہترین مصروفیت کا ذریعہ بنا دیا“۔

ہما بیگ صاحبہ نے اپنے سینٹر کا نام اپنے بیٹے کے نام پر ”وحید کے خواب“ رکھا ہے۔سینٹر کے قیام کے بعد ان کے دل میں ایک اور خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ سینٹر کی لڑکیوں کو کمپیوٹر کی ٹریننگ دلوا سکیں۔جب انہوں نے اس بات کا ذکر اپنے ایک ہم جماعت سے کیا تو اس ضمن میں انہوں نے معاونت فراہم کی اور پھر کمپیوٹر بھی آ گئے آج ان کے سینٹر میں وہ لڑکیاں جنہوں نے کبھی کمپیوٹر نہیں دیکھا تھا وہ کمپیوٹر پرنٹنگ سے لے کر ایکسل تک کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

ہما بیگ صاحبہ کا کہنا ہے کہ،سوشل ورک گھر سے شروع ہوتا ہے پھر باہر سے۔ماحولیاتی تبدیلی اور اس کے اثرات سے بچنے کے لیے بھی انہوں نے بہت کام کیا ہے۔پانی بچانا اور درخت لگانا ان کا بہترین مشغلہ ہے۔ہما بیگ صاحبہ اپنے والدین کا اپنا آئیڈیل مانتی ہیں۔اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہ بتاتی ہیں کہ،جب ان کی اسٹوڈنٹس انہیں یہ بتاتی ہیں کہ وہ گھر سے بھی کام کر رہی ہیں اور ان کو آرڈر ملنے بھی شروع ہو گئے ہیں۔ہما بیگ صاحبہ کے سینٹر پر پرانی بوتلوں اور ڈبوں کو بھی ریسائیکل کیا جاتا ہے اور پرانی چیزوں کو کارآمد بنایا جاتا ہے۔مستقبل کے لیے ان کی یہی خواہش ہے کہ ان لڑکیوں کو جو کمپیوٹر اور مشین خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتیں انہیں تحفتا یہ چیزیں دی جائیں تا کہ وہ کسی کی محتاج نہ ہوں۔نسل نو کے لئے ہما بیگ صاحبہ کا یہ پیغام ہے کہ،وہ اپنی زندگی میں تسلی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کریں۔کیونکہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔اپنے مذہب اور اپنی روایات کو نبھائیں۔تعلیم اپنی شخصیت کو سنوارنے کے لیے حاصل کریں اس لیے نہیں کہ کون سی ڈگری حاصل کرنا ہے یا زیادہ سے زیادہ کمانا ہے۔جو نصیب میں اللہ نے لکھ دیا ہے وہ مل کر رہتا ہے اس لیے جلد بازی نہ کریں صحیح اور غلط کا انتخاب سوچ سمجھ کر کریں۔

”اطراف“ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اخبارات کی ایک قدیم روایت ایڈیٹر کے نام خطوط کا تجزیہ شروع کیا ہے۔ اُردو اخبارات میں تو یہ اہم شعبہ ختم ہی کردیا گیا ہے۔ حالانکہ قارئین اس کے ذریعے درپیش مسائل پر اظہارِ خیال کی سہولت محسوس کرتے تھے۔ اس بار ”ڈان“ ڈیلی ٹائمز اور بزنس ریکارڈر میں ١٦ جنوری سے 15 فروری 2025 تک شائع ہونے والے اہم خطوط پر ڈاکٹر سیّد جعفر احمد کی نگرانی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تحریر کے توسط سے قارئین اطراف عوامی مسائل سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

انگریزی اخبارات میں ایڈیٹر کے نام خطوط میں غربت سرِ فہرست

تحریر: ذکیہ عباسی، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ

BUSINESS RECORDER

جہاں پابندیوں میں جکڑے ہوئے ایک سماج میں بطور ایک فرد ملک یا معاشرے کو متاثر کرنے والے مسائل کے بارے میں اپنی رائے اور خدشات کا اظہار کرنا اکثر مشکل محسوس ہوتا ہے، وہیں 'لیٹر ٹو دی ایڈیٹر' کا شعبہ اپنے خیالات کی جانب توجہ دلانے کا ایک طاقتور اور مؤثر طریقہ کار ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ پچھلے مضمون کی طرح اس مضمون میں بھی تین انگریزی اخبارات 'ڈان'، 'ڈیلی ٹائمز' اور 'بزنس ریکارڈر' میں 16 جنوری سے 15 فروری 2025 تک شایع ہونے والے خطوط پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے۔

ہر اخبار کی لیٹر ٹو دی ایڈیٹر کے کالموں میں شایع ہونے والے خطوط کے حوالے سے اپنی اپنی پالیسی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر روزنامہ 'بزنس ریکارڈر' کے اس شعبے میں بالعموم ملکی اور غیر ملکی مسائل کو معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ملک کے سماجی مسائل کو

2024 میں پاکستان میں گیارہ صحافی قتل کئے گئے

'ڈان' کے اس حصے میں بھرپور انداز میں پیش کیا جاتا ہے جبکہ 'ڈیلی ٹائمز' میں روزمرہ زندگی کے مسائل زیادہ اجاگر ہوتے ہیں۔ اخبار کا یہ حصہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک رہنے والے پاکستانیوں کے لیے ہے لیکن ان خطوط کا بغور جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس حصے میں چند ہی قارئین ہیں جو مختلف موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں تینوں انگریزی اخباروں میں شایع شدہ چند خطوط کا جائزہ سولہ عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

DAWN

غربت:

منور صدیقی اپنے مراسلے میں لکھتے ہیں کہ غربت میں اضافہ دراصل متوسط طبقے کے لوگوں کے غربت میں گرجانے کا نتیجہ ہے۔ واضح رہے کہ متوسط طبقہ عام طور پر ٹیکسوں کا بڑا حصہ ادا کرتا ہے اور پائیدار اشیاء کا ایک اہم صارف ہوتا ہے جب کہ نچلا طبقہ بہت غریب ہے۔ ریاست کی کمزوریاں، مہنگائی اور کم شرح نمو حالیہ دنوں میں نمایاں رہی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ لوگ غربت میں گرچکے ہیں۔ اس مسئلے سے نکلنے کا راستہ اشرافیہ کی گرفت کو ختم کرنا اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ملک کے وسائل صرف ایک طبقے کے ہاتھ میں نہ ہوں بلکہ سب کے لیے کھلے ہوں۔ جہاں حکومت مہنگائی کے خلاف اقدامات بھرپور طریقے سے کرتی ہے اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اگر عالمی سطح پر تیل کی قیمت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو اس کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔

Letter to the editor

THE EXPRESS TRIBUNE

ملازمتوں کے نئے مواقع

ثمینہ بھَون نشاندہی کرتی ہیں کہ وزیراعظم نے پرائم منسٹر یوتھ پروگرام کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ یہ منصوبہ ملک بھر میں روزگار کے نئے مواقع پیدا کرے گا لیکن ان کے پاس کوئی واضح تصویر یا حکمت عملی نہیں ہے جس کے ذریعے بے روزگاری کے چیلنج سے بامعنی انداز میں نمٹا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کو جدید تکنیکی مہارتوں سے آراستہ کرنا ایک قابل تعریف عمل اور جدیدیت کے تقاضوں میں سے ایک ہے۔ تاہم بدقسمتی سے موجودہ حکومت کی انفارمیشن ٹیکنالوجی خاص طور پر

اسکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد میں پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر

انٹرنیٹ کی طویل وقتوں تک سست روی نے اس شعبے میں ترقی کے امکانات کو نقصان پہنچایا ہے اور ترقی خواہشمندوں کی ایک بڑی تعداد کو ضرب لگائی ہے۔ لہٰذا ان کی نئی ملازمتیں پیدا کرنے کی اس بیان بازی میں زیادہ وزن نہیں ہے۔

شیریں ہدایت اللہ نے 'بزنس ریکارڈر' کے اس اداریہ کا حوالہ دیا ہے جس کا اختتام اس دلیل پر ہوا کہ ”ایک ہنرمند افرادی قوت لاکھوں لوگوں کو غربت سے نکالنے، آمدنی میں عدم مساوات کم کرنے اور

نوجوانوں میں بااختیار بننے کے احساس کو فروغ دینے کی کلید ہے۔ یہ مستقبل میں بھی ایک سرمایہ کاری ہے جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ پاکستان تیزی سے ترقی کرتی ہوئی عالمی معیشت میں مقابلہ کر سکتا ہے، بس ملازمتوں کی تخلیق ضروری ہے۔'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ حالیہ مہینوں یا سالوں میں خاص طور پر سمندروں میں پاکستانیوں کے ڈوبنے کے واقعات میں خطرناک اضافہ ملک میں روزگار کے مواقع کی کمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ دلیل معقول طور پر دی جاتی ہے کہ یہ روزگار کے مواقع کی کمی اور ملک کے مستقبل کے بارے میں بڑھتی ہوئی مایوسی ہے جو نوجوان پاکستانیوں کو خطرناک اور غیر قانونی نقل مکانی کو بہتر اور پرکشش زندگی کے ذرائع کے طور پر استعمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔

سیاسی سرگرمیاں

دبئی سے سکھبیر سنگھ برار نے لکھا کہ سابق وزیر اعظم اور پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے بانی عمران خان نے کہا ہے کہ القادر ٹرسٹ کیس سے انہیں اور ان کی اہلیہ بشریٰ بی بی کو مالی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہوا اور یہ کہ بزنس ٹائیکون ملک ریاض اس بات کی گواہی دینے کے لیے آزاد ہیں کہ وہ [عمران خان] واحد وزیر اعظم ہیں جنہوں نے کبھی بھی ان سے ذاتی یا مالی فائدے کے لیے کچھ نہیں مانگا۔ میرے خیال میں احتساب عدالت کے فیصلے کے بعد کے ان کے ریمارکس جس کے ذریعے وہ اپنی اہلیہ سمیت القادر ٹرسٹ کیس میں مجرم قرار پائے ہیں، مختلف وجوہات کی بنا پر بہت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ جن میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ملک ریاض اور ان کا بیٹا بھی شریک ملزم اور اشتہاری مجرم ہیں۔ مراسلہ نگار نے مزید لکھا کہ میں یہ بتاتا چلوں کہ بدعنوانی ایک عالمگیر خصوصیت ہے جو ہر ملک میں پائی جاتی ہے لیکن اس کے اثرات پاکستان میں زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ 2018 کے عام انتخابات میں عمران خان مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان کے اَنا ہزارے (بالخصوص ترقی پذیر ممالک کی تاریخ میں کرپشن کے خلاف تاریخی تحریک چلانے والے) بن گئے۔ ہزارے کی طرح عمران کو بھی ان کے دورِ اقتدار میں ایک نہیں بلکہ کئی حکمرانوں نے دھوکہ دیا اور اس کا سلسلہ 2023 میں ان کے خلاف عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعے ختم ہوا۔ ہزارے کی طرح عمران نے بھی عوامی حمایت میں کمی دیکھی ہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ عمران، جو ایک اینٹی کرپشن کروسیڈر رہے، خود ان کو کرپشن کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی ہے۔

بین الاقوامی واقعات

قمر سومرو کا خیال ہے کہ 2025 کی آمد، آتش بازی اور خوشی کے ساتھ منائی گئی جبکہ غزہ والوں کے پاس خونریزی اور غم کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آسمانی بجلی گرنے سے معصوم جانیں گئیں جن میں ان کے بچے بھی شامل ہیں۔ ان کے مصائب اور دردناک موت کی اَن کہی کہانیاں ضمیر کو جھنجھوڑ رہی ہیں۔ ساتھ ہی وہاں موسلادھار بارشوں اور کڑکتی سردی نے تباہی مچا دی تھی۔ ان کے لیے نیا سال امید کی کرن نہیں بلکہ انسانیت پروری کی عمل میں ناکامی کی ایک سنگین یاد دہانی تھا۔ جیسے ہی ہم 2025 میں قدم رکھتے ہیں، امید کی ایک کرن افق پر ابھرتی ہے اور ڈونلڈ ٹرمپ 20 جنوری کو اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے تیار ہیں۔ امریکی عوام کے اعلیٰ ترین مفادات اور فلاح و بہبود پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے "سب سے پہلے امریکہ" کو ترجیح دینے کا ان کا عہد، خونی جنگوں کے خاتمے کے لیے قابل تعریف ہے۔ اگر یہ وعدہ پورا ہو گیا تو عالمی امن کی کوششوں میں یہ ایک اہم موڑ ثابت ہو سکتا ہے۔

لاس اینجلس کے جنگلات میں لگی آگ نے بڑی تباہی اور اداسی پیدا کی ہے۔ اس حوالے سے واصف خالق داد لکھتے ہیں یہ واقعات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ فطرت کتنی طاقتور اور غیر متوقع ہو سکتی ہے۔ ایک ہی وقت میں، اس طرح کے مشابہ واقعات دنیا کے لیے ایک پیغام کی طرح محسوس ہوتے ہیں کہ ہمارے اعمال اور بے عملی کسی 'کرما' کی طرح نتائج لا سکتے ہیں۔ غزہ میں لوگ ہر روز مصائب کا شکار ہیں اور دنیا بالخصوص طاقتور مغرب یا تو خاموش ہے یا ناانصافی کی حمایت کر رہا ہے۔ وہ امن کے لیے کام کرنے کے بجائے مزید نقصان پہنچانے دے رہے ہیں۔ حالیہ جنگل کی آگ کو قدرت کے یہ کہنے کے انداز کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی انصاف سے بالاتر نہیں ہے۔ مزید اپنی سوچ کا اظہار کرتے ہوئے مراسلہ نگار نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ لاس اینجلس میں لگنے والی آگ پر جلد قابو پا لیا جائے گا، اور وہاں کے لوگوں کو تحفظ ملے گا۔ لیکن مجھے یہ بھی امید ہے کہ دنیا سبق سیکھے گی اور امن اور انصاف کے لیے کام کرے گی، خاص طور پر غزہ کے لوگوں کے لیے۔

جنگ بندی معاہدے کے بعد غزہ کی تعمیر نو کے مرحلے میں زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے، موجودہ حکومت کی وفاقی کابینہ کے فلسطینی عوام کی حمایت کے عزم کو سراہتے ہوئے سلیم خان خٹک نے لکھا کہ مجموعی طور پر غزہ کے پورے منظرنامے پر اداسی، خوف اور مایوسی کی لہر چھائی ہوئی ہے۔ چاہے جیسے بھی ہو پاکستان بے پناہ مشکلات اور چیلنجوں کے باوجود محصور فلسطینیوں کے لیے امدادی سامان بھیج رہا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ جنگ بندی شروع ہونے کے بعد سے اب تک سینکڑوں ٹرک ضروری سامان لے کر غزہ میں داخل ہو چکے

ہیں۔مزید برآں ان مصدقہ اطلاعات کے درمیان غزہ میں امدادی قافلوں کو لوٹنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے۔ بلا شبہ غزہ میں گھروں، اسکولوں، ہسپتالوں، مالز، دیگر انفراسٹرکچر اور لوگوں کی زندگیوں کی تعمیر نو کی اہمیت پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کے لیے بہت زیادہ وقت، کوشش اور پیسہ درکار ہوگا۔

حکومتی اداروں کی کارکردگی

خواجہ نجم الحسین لکھتے ہیں کہ قومی احتساب بیورو (نیب) نے حال ہی میں عوام کو خبردار کیا ہے کہ وہ دھوکہ دہی اور جعلسازی کی کوششوں سے گریز کریں، خاص طور پر غیر رجسٹرڈ ہاؤسنگ سکیموں سے نمٹنے کے دوران، اور اجنبیوں کے ساتھ ذاتی ڈیٹا شیئر کرنے سے گریز کریں۔ درحقیقت، اس طرح کے 'انتباہات' پہلے اسٹیٹ بینک آف پاکستان (SBP) کی جانب سے بھی جاری کیے گئے تھے، جو عوام کو ایسے ہی واقعات سے خبردار کرتے تھے۔ تاہم، نہ ہی نیب نے اور نہ ہی اسٹیٹ بینک نے کبھی ایسے شخص کی تفصیلات شایع کی ہیں جن سے ضرورت پڑنے پر رابطہ کیا جائے۔ متعلقہ حکام کو عوام کے لیے کسی بھی قسم کی وارننگ جاری کرتے ہوئے متعلقہ رابطہ کی معلومات کو بھی شایع کرنا چاہیے۔

تعلیم

انجینئر حسین احمد صدیقی نے تعلیم کے حوالے سے اپنے مراسلے میں لکھا کہ دنیا نے 24 جنوری کو تعلیم کا عالمی دن منایا، لیکن پاکستان کے پاس جشن منانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تعلیم پر ملک کا عوامی خرچ اس وقت اس کی مجموعی ملکی پیداوار (جی ڈی پی) کا 1.91 فیصد ہے، جو جنوبی ایشیائی خطے میں سب سے کم ہے۔ یہ تعداد 3.8 فیصد کی عالمی اوسط سے خطرناک حد تک کم ہے اور یونیسکو کے تجویز کردہ 4 فیصد بینچ مارک سے بہت کم ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں تعلیم پر پاکستان کے اخراجات میں کمی کا رجحان رہا ہے۔ تعلیم ایک بنیادی انسانی حق ہے، اور ثانوی سطح تک مفت تعلیم کی فراہمی کے ساتھ ناخواندگی کا خاتمہ آئین پاکستان میں درج بنیادی وعدوں میں شامل ہے۔ اس کے باوجود، اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونیسیف) کی 2022 کی رپورٹ کے مطابق، پاکستان میں 5 سے 16 سال کی عمر کے تقریباً 22.8 ملین بچے سکول نہیں جا رہے۔ یہ حیران کن اعداد و شمار دنیا میں اسکول سے باہر بچوں کی دوسری سب سے زیادہ تعداد کی نمائندگی کرتے ہیں، جو اسکول جانے کی عمر کی کل آبادی کا تقریباً 44 فیصد ہے۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ اگست 2024 کی پاک الائنس فار میتھ اینڈ سائنس (PAMS) کی ایک تازہ ترین رپورٹ کے مطابق یہ تعداد 25.3 ملین سے بھی زیادہ ہے۔

ریاض علی پنہور نے لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے پاکستان میں منعقد ہونے والی کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ طالبان کو مدعو کیے جانے کے باوجود ان کی غیر موجودگی لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے ان کے عزم کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے۔ جیسا کہ ملالہ نے بہت واضح انداز میں کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے مسئلے کو حل کیے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ عالمی برادری اس کی کال ٹو ایکشن پر توجہ دے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کام کرے کہ ہر جگہ لڑکیوں کو معیاری تعلیم تک رسائی حاصل ہو۔ سندھ میں، خاص طور پر دیہی علاقوں جیسے کہ ضلع کشمور کے دیہات میں، لڑکیوں کے لیے تعلیمی سہولیات کی کمی ایک تشویشناک صورتحال ہے۔ اس لاپرواہی کے طویل مدتی مضمرات ہیں، جو آنے والی نسلوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ جیسا کہ کہاوت ہے، ایک لڑکی کو تعلیم دینا پورے خاندان کو تعلیم دینے کے مترادف ہے، اس لیے دیہی سندھ میں لڑکیوں کے لیے تعلیمی سہولیات کی کمی کے بارے میں شعور بیدار کرنا ناگزیر ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم پر کارروائی کے لیے ملالہ کی درخواست ایک واضح کال ہے جسے ہم نظر انداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہی وقت ہے کہ عالمی برادری اکٹھی ہو اور اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر لڑکی کو تعلیم تک رسائی حاصل ہو جس کی وہ مستحق ہے۔

ظفروال کے طلبہ کو لائبریری تک رسائی کیلئے 27 کلومیٹر سفر کرنا پڑتا ہے

صبغہ شاہد لکھتی ہیں کہ ضلع نارووال کی ایک تحصیل ظفروال میں لائبریری نہیں ہے۔ طلباء کو پڑھنے کے مواد، حوالہ جاتی کتابوں اور تعلیمی وسائل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے روزانہ نجی ٹرانسپورٹ کے ذریعے نارووال تک 27 کلومیٹر کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ پورا تجربہ نہ تو آرام دہ ہے اور نہ ہی سستا ہے۔ یہاں تک کہ نارووال کی لائبریری بھی لوگوں کو دوستانہ ماحول فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ حکومت کو ظفروال میں علم تک رسائی کو بڑھانے اور سیکھنے کے کلچر کو فروغ دینے کے لیے ایک اچھی وسائل سے لیس لائبریری قائم کرنی چاہیے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی

جہانزیب بلوچ تربت سے لکھتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری جدید دنیا کو تشکیل دینے والی بہت سی ترقی اور اختراعات کے پیچھے محرک قوتیں ہیں۔ زندگی بچانے والی ادویات کی ترقی سے لے کر جدید ڈیجیٹل ٹولز کی تخلیق تک، جو ہمیں پوری دنیا سے جوڑتے ہیں، سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہماری زندگی کے ہر پہلو کو بدل دیا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ انسانیت کے کچھ اہم ترین چیلنجوں کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ترقی کے نئے مواقع پیش کرتے رہتے ہیں۔ سب سے اہم شعبوں میں سے ایک، جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی نے اثر ڈالا ہے وہ صحت کی دیکھ بھال کے شعبے میں ہے۔ طبی سائنس میں ترقی کے نتیجے میں زندگی بچانے والے علاج، ویکسین اور جراحی کی تکنیکوں میں ترقی ہوئی ہے۔ ٹیکنالوجی کی مدد سے اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ کینسر کی پہلے سے تشخیص کر سکتے ہیں، ذاتی نوعیت کے علاج تیار کر سکتے ہیں، اور یہاں تک کہ ان حالات میں بھی علاج کر سکتے ہیں جو کبھی ناقابل علاج سمجھے جاتے تھے۔ جینیات اور بائیوٹیکنالوجی جیسے شعبوں میں جاری تحقیق صحت کی دیکھ بھال میں مزید انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ صحت کی دیکھ بھال کے علاوہ، سائنس اور ٹیکنالوجی نے تعلیم، مواصلات، اور معیشت کو تبدیل کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ٹولز نے سیکھنے کے عمل کو مزید قابلِ رسائی بنا دیا ہے، جس سے طلباء کو دنیا میں کہیں سے بھی علم تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ حکومتوں، کاروباروں، اور افراد کو اس بات کو یقینی بنانے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے کہ ٹیکنالوجی کو ذمہ داری سے استعمال کیا جائے اور یہ کہ ناہمواریوں کو گہرا کرنے کے بجائے ٹیکنالوجی کے فائدے سب کے لیے قابلِ رسائی ہوں۔ مستقبل کو دیکھتے ہوئے، سائنس اور ٹیکنالوجی عالمی چیلنجوں جیسے کہ موسمیاتی تبدیلی، غذائی تحفظ اور غربت سے نمٹنے میں کلیدی کردار ادا کرتی رہے گی۔ قابل تجدید توانائی، پائیدار زراعت، اور ماحولیاتی تحفظ میں ایجادات پہلے سے ہی ایک سبز اور زیادہ پائیدار دنیا کی طرف بڑھنے میں ہماری مدد کر رہی ہیں۔ آخر میں لکھنے والے نے کہا کہ، سائنس اور ٹیکنالوجی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے بہت ضروری ہیں۔

صحافیوں کو جان کے خطرات

تحسین واجد علی نے موجودہ وقت میں صحافیوں کو لاحق خطرات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مراسلہ میں بیان کیا کہ نیویارک میں قائم کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس (سی پی جے) نے درست دعویٰ کیا ہے کہ 2024 تاریخ میں صحافیوں کے لیے سب سے مہلک سال تھا۔ دوسرے لفظوں میں 2024 میں کسی بھی دوسرے سال کے مقابلے میں زیادہ صحافی مارے گئے۔ جب سے صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی نے تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ کا ڈیٹا اکٹھا کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ عالمی سطح پر کل 124 صحافیوں کی اموات نے 2008 میں ہونے والی 113 اموات کے پچھلے ریکارڈ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تقریباً 70 فیصد صحافی اسرائیل کے ہاتھوں مارے گئے۔ مزید نشاندہی کی گئی کہ 18 ممالک میں کم از کم 124 صحافی مارے

گئے جو کہ 2023 سے 22 فیصد زیادہ ہیں۔ ہلاک ہونے والوں میں 82 فلسطینی تھے۔ 2024 پاکستان میں بھی صحافیوں کے لیے سب سے مہلک سال تھا کیونکہ اس سال کے دوران 11 صحافی مارے گئے تھے۔ تاہم بھارت میں 2015 سے اب تک 30 سے زیادہ صحافیوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔

سماجی رویے

نائرہ ایشال نے لکھا کہ انتہائی افسوس، دکھ اور بھاری دل کے ساتھ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے بیشتر ہموطنوں میں شہری احساس کا شدید فقدان ہے۔ خواہ بات رویے کی ہو یا پھر جلد بازی، چڑچڑاپن، اور مایوسی کی، کیا ہم نے کبھی ان وجوہات کو کھودنے کی کوشش کی ہے کہ کون اس مخدوش صورتحال کا ذمہ دار ہے؟ ہم جانتے ہوں گے کہ اکثر وجوہات بہت معمولی ہوتی ہیں۔ ہم ایک منٹ میں صبر کھو بیٹھتے ہیں اور جھگڑا شروع کر دیتے ہیں اور پھر پچھتاتے ہیں۔ جب ناقابل تلافی نقصان ہو جائے تو اس افسوس کا کیا فائدہ؟ وفاداری، ایمانداری، لگن اور عزم وہ خوبیاں ہیں جو ہم پر اچھے نقوش چھوڑتی ہیں، اور ان کی بازگشت ہمیں حوصلہ دیتی رہتی ہے اور ہمیں ماحول میں مزید خوشگوار توانائی پیدا کرنے کے لیے خوراک فراہم کرتی ہے، جس سے پیداواری صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، برائیاں ہمیں پریشان اور پراگندہ کر دیتی ہیں۔ لہٰذا جب برائیوں، تکلیف دہ رویوں، اور ظالمانہ کاموں کے اثرات برے ہیں تو ہم ان کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔

اکرام بلوچ نے خوبصورتی کے معیارات اور کمیونٹی میں سماجی احترام پر فیئرنس کریم کے اثرات سے متعلق لکھا کہ یہ کریمیں خوبصورتی کا ایک ایسا معیار بناتی ہیں جو نہ پائیدار ہے اور نہ ہی صحت بخش۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ یہ پروڈکٹس واضح طور پر معاشرے کے ممبران کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ سیاہ رنگ کی جلد کسی نہ کسی طرح اتنی اچھی نہیں ہے۔ درحقیقت، یہ رجحان شناخت پر حملہ ہے، اور یہ بلا روک ٹوک جاری ہے۔ تاریخی طور پر، گوروں کے لیے نسلی فائدہ نوآبادیاتی حکمرانی کے دوران ابھرا اور یہ اب بھی ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اور نسلی ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ میڈیا اور اشتہاری کمپنیوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نقصان دہ اور دقیانوسی تصورات کو برقرار رکھنے والی مصنوعات یا پیغامات کی توثیق کرنے کے بجائے ہمارے لوگوں کے حقیقی تنوع کی عکاسی کریں۔ اس بات پر مکالمہ ہونا چاہیے کہ ہم کس طرح زیادہ جامع اور منصفانہ سوچ رکھنے والے معاشرے کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ لوگ ان فرسودہ اور نقصان دہ خیالات سے آزاد ہو جائیں جو محض ہمارے اندر موجود دقیانوسی تصورات کو تقویت دے رہے ہیں۔

غیر قانونی ہجرت

امجد نصیب تربت، کیچ سے لکھتے ہیں کہ ستم ظریفی یہ ہے کہ لوگ بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنی جانیں گنوا رہے ہیں۔ حالیہ المناک واقعہ جس میں تارکین وطن کی ایک کشتی جس میں 66 پاکستانیوں سمیت 86 افراد بحر اوقیانوس کو عبور کرنے کی کوشش کے دوران ڈوب گئے، یہ دل دہلا دینے والا ہے کہ بہتر زندگی کی تلاش میں بحر اوقیانوس کو عبور کرتے ہوئے یورپ پہنچنے کی کوشش میں 50 کے قریب پاکستانی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ واقعہ غیر قانونی طور پر یورپ پہنچنے کی کوشش کرنے والے تارکین وطن کو درپیش خطرات کو اجاگر کرتا ہے۔ ہماری حکومت کو اس مسئلے کی بنیادی وجوہات کو حل کرنے کے لیے فوری اقدام کرنا چاہیے اور مستقبل میں ایسے سانحات کو روکنے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ کوئی بھی اپنے وطن، ثقافت اور برادری کو غیر مانوس علاقوں میں غیر یقینی مستقبل کے لیے چھوڑنے کا انتخاب نہیں کرتا جب تک کہ مایوسی انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہ کرے۔ صرف انتہائی کمزور اور غریب افراد ہی اپنے آپ کو ایسے مشکل انتخاب کرنے پر مجبور پاتے ہیں۔ مزید برآں مراسلہ نگار نے ہماری حکومت اور متعلقہ حکام پر زور دیتا ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف ایسے مخصوص سانحات سے نمٹنے کے لیے فیصلہ کن اقدام کریں بلکہ مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے طویل المدتی حل پر بھی عمل درآمد کریں۔

وزیراعظم کے نئی ملازمتوں کے بیان میں وزن نہیں ہے

جرائم اور خوف وہراس

سومرو خان کے مطابق ضلع کشمور ایسا لگتا ہے کہ جرائم پیشہ افراد کے گڑھ میں تبدیل ہو گیا ہے، خاص کر ڈاکو آزادانہ گھوم رہے ہیں۔ اس شہر میں لوگوں کو حملے اور اغوا کرنے اور ان کی املاک لوٹنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں، اس کے باوجود پولیس ان کو پکڑنے کے لیے کچھ نہیں کر رہی۔ ڈاکوؤں کی موجودگی نے ضلع کشمور کو انتہائی عدم تحفظ کی وجہ سے ناخوشگوار ایریا بن گیا ہے۔ لوگوں کو اکثر تاوان کا مطالبہ کرنے کی نیت سے اغوا کیا جاتا ہے اور حال ہی میں لوٹ مار کے لیے روڈ جام کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ کاروبار اور دکانیں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بند ہو جاتی ہیں کیونکہ لوگ مسلسل خوف میں رہتے ہیں۔ اس جبر کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی اور آمدن متاثر ہوئی ہے۔ منتخب نمائندے اور انتظامیہ شہریوں کی شکایات سننے اور ان کا جواب دینے سے کہیں زیادہ اپنی فلاح و بہبود کی فکر میں نظر آتے ہیں۔ ضلعی پولیس بھی کمزور اور بے حرکت نظر آتی ہے اور ان مجرموں کے خلاف سخت کارروائی نہیں کرتی۔ مزید لکھتے ہوئے کہا کہ میری حکومت اور اعلیٰ حکام سے عاجزانہ درخواست بن گئی ہے کہ وہ ذمہ داری قبول کریں اور کشمور کے لوگوں کی حفاظت کو یقینی بنائیں، اور عوام کو خوش اور بے خوف زندگی گزارنے کا حق دیں۔

میڈیا کا غلط استعمال

مائدہ سلطان نے ہمارے معاشرے میں جعلی خبروں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ یہ سلسلہ خاص طور پر سوشل میڈیا کے ذریعے زیادہ عروج پر ہے۔ یہ تشویشناک ہے کہ ان پر کتنے لوگ بغیر کسی سوال کے بھروسہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ گمراہ کن یا مکمل طور پر غلط معلومات کا بھی اشتراک کرتے ہیں۔ مزید مراسلہ نگار نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں میڈیا کی خواندگی کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں لوگوں کو خاص طور پر نوجوان نسلوں کو یہ سکھانا چاہیے کہ وہ آن لائن ملنے والی معلومات کا اندازہ کیسے لگاتے ہیں، اور انہیں ان ذرائع سے سوال کرنے کی ترغیب دینی چاہیے، جن پر وہ انحصار کرتے ہیں۔ جعلی خبروں کے خطرات پر تعلیم کو فروغ دے کر اور حقائق کی تصدیق کی اہمیت پر زور دے کر ہم سوشل میڈیا کی معلومات پر اعتماد بحال کرنا شروع کر سکتے ہیں جو واقعی اہمیت رکھتی ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی

گوہر عارف نے لکھا کہ پاکستان کو شدید ماحولیاتی مسائل کا سامنا ہے، بشمول پانی، ہوا اور مٹی کی آلودگی۔ فضائی آلودگی خاص طور پر اہم ہے، بڑے شہروں میں آلودگی کی شرح 98.3 فیصد تک ہو جاتی ہے۔ اس آلودگی میں کردار ادا کرنے والے عوامل میں گاڑیوں اور فیکٹریوں سے دھوئیں کا اخراج، تیل کے ایندھن کا استعمال، جنگلات کی کٹائی اور کاربن مونو آکسائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ جیسی نقصان دہ گیسیں شامل ہیں۔ فضائی آلودگی سے پاکستان میں سالانہ تقریباً 128,000 اموات ہوتی ہیں۔ آبی آلودگی بھی 80 فیصد آبادی کو متاثر کرتی ہے۔ مزید تجویز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت کو صنعتوں کو کم کرنے، جنگلات کی کٹائی کو روکنے اور ماحول دوست طریقوں کی حوصلہ افزائی کے لیے فوری اقدام کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے پاکستان آلودگی کے تباہ کن اثرات کو کم کر سکتا ہے اور اپنے شہریوں کے لیے ایک صحت مند، زیادہ پائیدار مستقبل بنا سکتا ہے۔

ملاوٹ زدہ اشیاء

پرکاش میگھوار نے، جو سندھ فوڈ اتھارٹی کے عوامی تجزیہ کار ہیں، اعداد و شمار کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ ملاوٹ شدہ دودھ پاکستان بھر میں آزادانہ طور پر فروخت اور استعمال کیا جاتا ہے۔ دودھ انسانی

غذائیت کا ایک لازمی حصہ ہے لیکن پاکستان میں یہ غیر صحت مندانہ طریقوں سے بیچے جانے کی وجہ سے تشویش کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ ٹنڈو جام میں دودھ کے طبعی اور کیمیائی معیار پر 2009 کے ایک مطالعے میں، مختلف ذرائع سے 125 نمونے اکٹھے کیے گئے جن میں ملاوٹ کی خطرناک سطح کا انکشاف ہوا۔ عام طور پر دودھ میں پانی اور برف ملا کر اس کا معیار گرایا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں 2016 کے ایک مطالعہ میں بھی ان نتائج کی بازگشت سنائی دی، جس سے یہ ظاہر ہوا کہ دودھ میں ملاوٹ کے لیے 49 فیصد پانی اور 28.8 فیصد میں ڈیٹرجنٹ کا استعمال کیا گیا تھا۔ دیگر ملاوٹ میں گنے کی شکر اور نشاستہ شامل تھا۔ 2017 کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کی لیبارٹری میں 16 برانڈز کے پیک شدہ دودھ کا تجربہ کیا گیا، نقصان دہ بیکٹیریا کو ختم کرنے کے لیے بنائے گئے مختلف مراحل سے گزرنے کے باوجود صرف چھ نمونے ہی حفاظتی معیارات پر پورا اترے۔ 2020 میں اس کے بعد کے مطالعے نے بحران کے بارے میں ایک وسیع پس منظر فراہم کیا۔ سندھ بھر میں 900 دودھ کے نمونوں میں سے 82.78 فیصد ملاوٹ شدہ پائے گئے۔ تحقیقات میں 20 اشیاء کا پتہ چلا جو دودھ میں ملاوٹ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں، جن میں پانی، ڈیٹرجنٹ، چاول کا آٹا، گنے کی شکر، نشاستہ، کاسٹک سوڈا، اور یہاں تک کہ خطرناک مادے جیسے فارملین، ہائیڈروجن پیروآکسائیڈ اور بورک ایسڈ بھی شامل ہیں۔ گویا دودھ پاکستان میں صحت عامہ کے لیے ایک خاموش خطرہ بن گیا ہے۔ دودھ کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پاسچرائزیشن کے لازمی قوانین کے ساتھ سخت ریگولیٹری نگرانی کو نافذ کیا جائے اور اہم مقامات پر معیار کی باقاعدہ جانچ کی جائے۔

صحت عامہ کو لاحق خطرات

طلحہ آصف نے لکھا ہے کہ کراچی میں آوارہ کتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد صحت عامہ اور تحفظ کے لیے خطرہ ہے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں کتے کے کاٹنے کے متعدد واقعات، خاص طور پر بچوں اور بوڑھوں کو متاثر کرنے کے واقعات رپورٹ ہوئے ہیں۔ یہ حملے شدید چوٹوں اور یہاں تک کہ ہلاکتوں کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان جانوروں کی موجودگی لوگوں بالخصوص خواتین اور بچوں میں خوف اور پریشانی کا احساس پیدا کرسکتی ہے۔ آوارہ کتوں کی آبادی پر قابو پانے کے لیے موثر اقدامات کا فقدان مسئلہ ہے۔ کراچی میونسپل کارپوریشن (KMC) کو اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ایک جامع حکمت عملی کے ساتھ آگے آنے کی ضرورت ہے۔

یوسف عزیز نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اسلام آباد کے رہائشیوں کے لیے ہیلتھ کارڈز کی سہولت دستیاب نہیں ہے۔ اسلام آباد میں سرکاری شعبے کے تین ممتاز ہسپتال ہیں جو دوسرے صوبوں کے شہریوں کو مفت علاج فراہم کرتے ہیں۔ تاہم اسلام آباد کے رہائشیوں کو لاجسٹک اور مالی مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود ان ہسپتالوں میں اپنے علاج کے اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ صورتحال خاص طور پر معمر شہریوں اور ریٹائرڈ ملازمین کے لیے ایک اہم چیلنج کا باعث بنتی ہے، جنہیں متعدد لیبارٹری ٹیسٹوں اور طبی علاج کی صورت میں بھاری اخراجات برداشت کرنا انتہائی مشکل لگتا ہے۔ مزید کہا کہ امورِ مملکت کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ وہ اسلام آباد کے تمام رہائشیوں کو ہیلتھ کارڈ کی سہولت فراہم کر کے اس دیرینہ مسئلے کو فوری حل کریں۔ اس سے وہ مختلف ممتاز ہسپتالوں میں مفت علاج حاصل کرسکیں گے۔

امن و عامہ کی خراب صورتحال

اسامہ جاوید نے اپنے مراسلے میں لکھا کہ روزانہ موٹر سائیکل چوری کی وارداتوں میں خطرناک حد تک اضافہ روہڑی کے لوگوں میں بے چینی پیدا کر رہا ہے۔ متعدد شکایات کے باوجود حکام اس بڑھتی ہوئی لعنت کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ زیادہ تر واقعات رات 8 بجے سے رات 10 بجے کے درمیان ہوتے ہیں جب شہر میں لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے۔ پولیس کے سخت گشت، نگرانی کے بہتر نظام اور مجرموں کو سزائیں دینے کی ضرورت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے عوامی تحفظ کو ترجیح دیں اور امن و سلامتی کی بحالی کے لیے فیصلہ کن کارروائی کریں۔

عظیم حسن میتلو لکھتے ہیں کہ پاکستان میں لوگ اکثر خوشی کے موقع پر ہوائی فائرنگ کرتے ہیں اور انہیں اس عمل سے لوگوں اور املاک کو لاحق خطرے کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ خطرناک رجحان نہ صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی پر سوالات اٹھاتا ہے بلکہ اس سے بڑھتی ہوئی صوتی آلودگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ہوائی فائرنگ کے لیے استعمال ہونے والے ہتھیار زیادہ تر بغیر لائسنس کے ہوتے ہیں اور یہ اپنے طور پر بھی ایک جرم ہے۔ ہم سب کو صحت مند رجحانات کو اپنانا اور فروغ دینا چاہیے۔

کلثوم ابڑو نے حکومتی احکام کی غفلت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ ضلع لاڑکانہ کے علاقے گریلو سے عمر بھیو تک کی سڑک کافی عرصے سے نامکمل ہے۔ اسی طرح بکرانی کو گیریلو سے ملانے والی سڑک کا بھی یہی حال ہے۔ متعلقہ حکام کو چاہیے کہ وہ اس معاملے کو دیکھیں اور ان منصوبوں کو مکمل کریں جو درحقیقت مقامی لوگوں کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔

Feel like

غزالہ خالد کی تصنیف ان کہی پرنٹ اور ڈجیٹل کا امتزاج ہے۔یہی مستقبل کی تحریریں ہیں۔زمانہ بدل رہا ہے۔اگر چہ پاکستان نہیں بدل رہا ہے۔غزالہ خالد پاکستان کے آتے جاتے لمحوں پر گہری نظر رکھتی ہیں۔دل میں تڑپ ہے۔ذہن میں روشنی ہے۔Feel likeیقیناً احساس اس درد کا ظہار ہے لیکن اس درد میں دوا بھی ہے۔مسائل کا درحال بھی۔پڑھیئے اپنی رائے دیجئے۔

تمہارے ہاں گیس کب آتی ہے۔کب جاتی ہے

تحریر:..............غزالہ خالد

ارے واہ بھئی واہ ! شاباش ہے بھئی شاباش ہے ! اب آپ لوگ پوچھیں گے کس کو شاباشی دی جارہی ہے ؟ تو بھئی حکومت کو شاباش دے رہے ہیں اور کس کو دے رہے ہیں۔ایسی زبردست پالیسی بنائی کہ پلک جھپکتے ملک کے سارے مسائل پر قابو پالیا۔ پیارے قارئین حیران کیوں ہیں؟ ذرا سوچیۓ تو کہ جب سے رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوا ہے عوام کی کیا کیفیت ہے نہ کسی کو" نوجوان کا حالیہ بے دردانہ قتل یاد رہا" اور" نہ نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ کرنے والے نوجوان" ،نہ" کوئی قید میں پڑا سیاسی قیدی یاد آیا" اور نہ ہی ٹینکر اور کنٹینروں کے حادثات کا خیال آیا" نہ" مہنگائی یاد رہی اور نہ ہی سینیٹ اور قومی اسمبلی"۔اب رمضان میں ساٹھ صفحات کا خودنمائی کا ضمیمہ آئے یا 124 تصاویر! عوام کی بلا سے، انہیں اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اب آپ لوگ سمجھ گئے ہونگے ناں کہ ہم نے ایسا کیوں محسوس کیا ہے؟ اگر اب بھی نہیں سمجھے تو

مستقبل کی پلاننگ نہ ہوتو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے

ہم سمجھا دیتے ہیں کہ رمضان شروع ہوتے ہی سب سے پہلے تو عوام نے جی بھر کر ایکدوسرے کو رمضان کی مبارکباد دی جب مبارکباد کے پیغامات سے موبائل فون کے واٹس ایپ بھر گئے اور اطمینان ہوگیا کہ بچے، جوان، بوڑھے سب کو خبر کر چکے ہیں کہ رمضان شروع ہوچکا ہے تو سب سحری کر کے سو گئے اور جب صبح سو کر اٹھے تو چراغوں میں روشنی نہ تھی بس وہ دن ہے اور آج کا دن ! سب کچھ بھول چکے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور پھر دن بھر ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں" تمہارے ہاں گیس کب آتی ہے؟" یا" تمہارے ہاں گیس کب جاتی ہے؟" ان دو سوالوں کے علاوہ اب عوام کو کچھ بھی یاد نہیں ہے۔خواتین الگ Feel like بولائی بولائی ہیں کہ سارا وقت چولہے کو کھولتے بند کرتے گذر جاتا ہے۔سوئی گیس نے بھی نت نئے طریقوں سے تنگ کیا کبھی اچھی خاصی آتے آتے" مفلس کے چراغ" کی مانند ہوجاتی اور پھر بھاگ دوڑ مچ جاتی کہ افطار کا وقت ہونے والا ہے سلنڈر رکھلو بچوں اور بوڑھوں کے کھانے ناشتے کے دوست اور ان کی پارٹیاں جن میں نشہ کرنا فیشن۔نقلی دنیا میں رہنے والے نوجوانوں کو یہی پتہ نہیں ہوگا کہ وہ پاکستان میں رہتے ہیں۔گھر سے باہر بھی نکل جائیں تو نشے میں جھومتے گاڑی چلاتے کسی کو بھی اڑا دیتے ہیں کارساز کا واقعہ اس کی مثال ہے۔رہ گئے والدین تو ان کی اپنی الگ دنیا ہے اولاد سے ہی ملاقات کُبھی کبھار ہوتی ہے۔ بے تحاشا پیسہ اور اولاد کی طرف سے لاپرواہی کا انجام اسی طرح لرزہ خیز قتل کی صورت میں نکلتا ہے جیسے کبھی نور مقدم، کبھی شاہ زیب جتوئی تو کبھی مصطفی عامر کیس۔جو ہمارے ملک میں آتے رہتے ہیں اور پھر یہ کیس اپنی موت آپ مرجاتے ہیں بس اللہ رحم فرمائے اور دعا ہے کہ اس کیس کا فیصلہ بھی حق و انصاف کے ساتھ ہو۔دعا تو اس کے لئے بھی بہت کی تھی بھئی اسی کرکٹ کے لئے کہ رمضان میں تازہ تازہ کرکٹ ٹورنامنٹ بھی تو ہارے ہیں جو کروڑوں

اسٹیڈیموں کے ہارسنگار میں لگا سرمایہ کراچی کا کچرا اٹھانے کے کام آسکتا تھا

کی الگ دقت ہوئی لیکن بس ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ عوام سب کچھ بھول گئے جی ہاں" اب ان کو نہیں کچھ بھی سوئی گیس" کے سوا یاد۔بچپن میں معاشرتی علوم میں پڑھا تھا کہ پاکستان میں 1950 میں گیس دریافت ہوئی تھی جس کے بڑے ذخائر موجود ہیں اور جب سے وہ عوام کو فراہم کی جارہی ہے لیکن جب مستقبل کی پلاننگ نہیں کی جاتی تو قارون کے خزانے بھی خالی ہوجاتے ہیں اس لئے یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔بھئی سوئی گیس کے تنگ کرنے کے باوجود ہم تو نوجوان کے لرزہ خیز قتل اور نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ کو نہیں بھول سکے۔دل جلتا ہی رہا کہ ہمارے ملک کے نوجوان کہاں جارہے ہیں اور ان کے والدین کیا کرر ہے ہیں؟ محترم محمود شام صاحب کہتے ہیں کہ ادبی تقریبات میں نوجوانوں کو بلانا چاہیۓ بالکل صحیح کہتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں نوجوانوں کی زندگی کیا ہے؟ خصوصاً اپر کلاس کے بچے ہر وقت سوشل میڈیا پر آن لائن رہتے ہیں، باہر کا طرز زندگی، باہر کی فلمیں، باہر کے طرح طرح کے وڈیو گیمز اور ان کا کمرہ، ان روپیہ اسٹیڈیموں کے ہارسنگھار میں لگا یا کراچی کا کچرہ ہی اٹھانے کے کام آجاتا ایک دو ٹوٹی پھوٹی سڑکیں ہی بن جاتیں اب عوام کیا نیشنل اسٹیڈیم کا اچار ڈالیں گے! ارے میرا خیال ہے اب بس کردیں !! ہم تو بہت ہی سنجیدہ ہو گئے میٹھی عید آنے والی ہے کوئی میٹھی بات تو کی ہی نہیں ! میٹھی عید سے بھی یاد آیا کہ ایک بات اور کان کھول کر سن لیجیۓ کہ ہمارے ملک سے چینی بھی" ٹاٹا بائے بائے" کر گئی ہے اور اب حکومت چینی بھی درآمد کرے گی یعنی کہاں گئے وہ گنے کے کھیت ! وہ شوگر ملیں ! وہ خود کفیلی ! ارے بھیا کیا معاشرتی علوم میں سب کچھ ہی جھوٹ لکھا تھا ؟؟؟ چلیں سب باتیں چھوڑیں چند دن بعد عید منائیں اور ہماری طرف سے پیشگی عید مبارک قبول کرلیں۔ہمارے ملک میں تو ویسے بھی یہی ہے" عید" کی اصل کہانی ہر سال وہی خوشی، وہی پریشانی۔۔۔۔

شادی یا بدلہ؟

عورت نمبر کے لیئے ایک انتہائی سچی کہانی یہ صرف معصومہ بیتی نہیں ہے۔ جگ بیتی ہے۔ جنوبی پنجاب سے یہ بیٹیاں کراچی میں حصولِ رزق کیلئے گھروں میں خدمات انجام دیتی ہیں۔ ان سب کی داستانیں ایک سی ہیں۔ اس لیے جہاں آراءنے کچھ بیٹیوں سے بات ان کی ابتلاوں کو یکجا کیا۔ اکیسویں صدی میں گزشتہ صدیوں کی یہ قبیح رسمیں اب تک کیوں موجود ہیں۔

اب معصومہ ایک صنف آہن ہیں!

تحریر: جہاں آراء

وٹے سٹے کی شادی پاکستان میں خاص کر دیہاتی علاقوں میں آج بھی عام ہے۔ وٹہ سٹہ میں دو خاندانوں کے ایک بیٹا یا بیٹی کی شادی دوسرے خاندان کے بیٹا یا بیٹی سے تبادلہ میں کردی جاتی ہے۔ وٹے سٹے سے مراد یہ ہے کہ، دو خاندان آپس میں اپنی بیٹیوں کی شادی اس شرط پر کرے کہ ہر ایک دوسرے کو اپنی بیٹی نکاح میں دے گا اور حق مہر نہیں ہوگا، یعنی کہ ایک لڑکی کے بدلے میں دوسری لڑکی لی جائے، ایسی صورت کو عربی میں "شغار" کہتے ہیں اور اردو میں وٹہ سٹہ۔ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "نکاحِ شغار" سے منع فرمایا ہے اور شغار یہ ہے کہ آدمی اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسے کر کے دے گا اور ان کے درمیان مہر مقرر نہ کیا جائے (یعنی دونوں عورتوں کو ایک دوسری کا مہر تصور کیا جائے)۔ (صحیح مسلم)

یہ ایک قدیم رسم ہے جو پاکستان سمیت دیگر مشرقی ممالک میں نسل در نسل چلی آ رہی ہے۔ جہاں ایک جانب اس طریقے کے تحت بچوں کے رشتے کرنا آسان ہو جاتا ہے وہیں دوسری جانب اس کے کچھ بہت ہی سنگین اثرات بھی پائے جاتے ہیں جس کا شکار خاص کر بیٹیاں ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو پورے کے پورے خاندان ہی اس قسم کی شادیوں کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں۔ وٹے سٹے کے دلدل میں دھکیلے جانے والی ایک ایسی ہی خاتون معصومہ کے کرب کی داستان قارئین کی نذر ہے۔

معصومہ کا تعلق تحصیل خان پور رحیم یار خان سے ہے۔ شادی کے وقت عمر 14 سال تھی۔ 6 بہنیں اور 4 بھائی ہیں۔ معصومہ سب سے بڑی ہیں۔ اس وقت عمر 35 یا 36 سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی شادی وٹے سٹے کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ معصومہ کے والدین، چاچا اور ماموں وغیرہ کی شادی بھی وٹے سٹے کی بنیاد پر ہی ہوئی تھی۔ یعنی اس خاندان میں یہ رسم عام ہے۔ شادی کے وقت معصومہ کی نند بالغ نہیں تھی، جسے اس کے وٹے میں یعنی اس کے بدلے اس کے بھائی کہ نکاح میں آنا تھا۔ لہذا صرف معصومہ کی رخصتی ہوئی اور بھائی کی رخصتی کے لئے انتظار کرنا پڑا۔ لیکن یہ انتظار معصومہ کو بہت مہنگا پڑ رہا تھا، کیونکہ اس کے سسرال والوں کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نا تھا۔ اس لئے معصومہ کو ایک سال میکے ہی میں رہنا پڑا۔ ایک سال بعد خاندان کے بڑوں نے صلح کروا کر اسے واپس سسرال بھجوایا کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب کہ معصومہ کے ماں باپ کی طرف سے ان کے بیٹے کی شادی کی بات کی گئی یعنی معصومہ کی نند کا نکاح معصومہ کے بھائی کے لئے مانگا گیا۔ اور معصومہ کو اسی شرط پر سسرال واپس بھیجا گیا تھا کہ اس کے بدلے اس کی نند کا نکاح اس کے بھائی سے کیا جائے۔ لہذا بھائی کی شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ لیکن اب پھر سارا معاملہ الٹا ہونے لگا۔ ماضی کی کچھ تلخیوں کے باعث پھر اس خاندان میں جھگڑا ہوا اور مایوں کے بعد ٹھیک بارات والے دن اس کے سسرال والوں نے نکاح سے انکار کردیا۔ اس لئے بارات خالی ہاتھ واپس آگئی۔ یہاں ایک بار پھر خاندان کے بڑوں کو صلح کے لئے بیچ میں آنا پڑا لہذا اگلے دن جس دن کے ولیمہ ہونا تھا معصومہ کے بھائی کا نکاح ہوا اور اس کی نند رخصت ہو کر گھر آئی۔ اسی کشمکش میں

بیٹی پیدا ہونے پر معصومہ کو ایک سال میکے میں گزارنا پڑا

تھا۔ اور جب تک اس کی نند اس کی بھابھی بن کر اس کے گھر نہیں چلی جاتی اسے یہ رویے برداشت کرنا تھے۔ کیونکہ وٹے سٹے میں تو ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کی خوشی کے بدلے ہی سکون یا خوشی نصیب ہوتی ہے۔ شادی کے اگلے سال معصومہ کو اللہ نے بیٹی کی نعمت سے نوازا۔ اس کی بیٹی آپریشن سے ہوئی تھی۔

معصومہ کی کہانی
اُسی کی زبانی

لیکن اس کے سسرال والوں کو بیٹا چاہیئے تھا اس لئے انہوں نے معصومہ کو اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کردیا۔ اس موقع پر اس کا شوہر بھی اپنے گھر والوں کے بھڑکانے پر معصومہ سے ناراض ہوگیا

ایک سال اور بیت گیا اور اللہ نے معصومہ کو ایک اور بیٹی سے نوازا۔ اس کی یہ بیٹی بھی آپریشن سے ہوئی تھی۔ اس بار اس کے شوہر نے کوئی واویلا نہیں ڈالا۔ معصومہ کا کہنا ہے کہ اس کے شوہر کو تو بیٹیاں پسند تھیں بس اپنے گھر والوں سے بھڑکانے پر لڑائی کرتا تھا۔ لیکن معاملہ صرف بیٹیوں کی پیدائش کا ہی نا تھا بلکہ معصومہ کے سسرال والوں اور شوہر سے بڑھتی ہوئی خلش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ معصومہ کے ہاں اولاد آپریشن سے ہوتی تھی جس پر اچھا خاصہ خرچہ آتا تھا۔ اور پھر اتنے خرچے کے بعد بیٹی کی پیدائش اس پر تو معصومہ کو احساس جرم دلوایا جاتا تھا۔

بہر حال زندگی گزر رہی تھی اور ہر موڑ پر ایک نیا امتحان لے رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مالی پریشانی کے باعث معصومہ کے والدین روزگار کی تلاش میں کراچی آگئے تو معصومہ بھی ان کے ساتھ ہولی۔ اب اس کا شوہر بھی کراچی میں مزدوری کر رہا تھا۔ والد دکانوں پر پاپڑ سپلائی کرتے اور شوہر آٹے کی مل سے آٹا دکانوں پر سپلائی کرتا جبکہ معصومہ

شادی یا بدلہ؟

گھروں میں کام کاج کیا کرتی تھی۔گزر بسر ہو رہا تھا۔کچھ دن کے لئے معصومہ کو لگا کہ غم اس کے گھر کا راستہ بھول گئے ہیں۔لیکن وہ

والد دکانوں پر پاپڑ سپلائی کرتے شوہر آٹے کی مل سے آٹا

بھی راستہ بھول کر جاتے کہاں؟ ان کا تو اصل ٹھکانہ ہی غریبوں کی چوکھٹ ہے۔بس وہیں ڈیرے ڈالے رکھنے میں ان کی بقا ہوتی ہے۔لہذا اب معصومہ کے والدین کو بیٹی کا ساتھ رہنا مہنگا لگنے لگا تھا اس لئے اسے اپنے شوہر کے ساتھ علیحدہ گھر لینا پڑا جس کا کرایہ وہ مشکل سے دے پاتی تھی۔شادی کے تیسرے سال پھر اللہ نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا لیکن اس بار بھی بیٹی پیدا ہوئی۔اس بیٹی کی پیدائش کے وقت اس کی بڑی بیٹی سخت بیمار تھی۔معصومہ اسے علاج کے لئے اپنے گاؤں لے گئی۔لیکن کافی علاج کے بعد بھی بچی جانبر نا ہوسکی۔ایک بیٹی کی موت کا غم ہلکا نا ہوا تھا کہ اللہ نے پھر سے اس کی گود میں بیٹی ہی ڈال دی۔اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بیٹی کی پیدائش پر خوشی مناتے ہیں یا غم؟اس بار معصومہ بھی بہت بیمار ہوگئی تھی، ہر بچے کی پیدائش پر اسے آپریشن کے لئے اپنے آبائی گاوں جانا ہوتا تھا کیونکہ وہاں آپریشن کے اخراجات کم ہوتے تھے۔اور اس کے گھر والوں کو یہ بھی لگتا تھا کہ شاید گاؤں میں علاج اچھا ہوتا ہے۔

اسی دوران معصومہ کی نانی کا انتقال ہوگیا جس کے بعد اسکے والدین واپس گاؤں چلے گئے اور معصومہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی ہی میں رہی۔لیکن اب معصومہ کے سسرال والے کچھ عرصہ کے لئے کراچی آ گئے تھے۔کیونکہ معصومہ کا دیور عمرہ کرنے جا رہا تھا وہ اسے چھوڑ آئے تھے۔اس مقصد کے لئے انہوں نے معصومہ کے شوہر سے بیس ہزار روپے کا تقاضہ کیا جو وہ نا دے سکا۔اسی وجہ سے نا صرف یہ اسے ماں باپ کی ناراضگی سہنا پڑی بلکہ اس کا بھائی بھی اس سے ملے بغیر عمرے پر چلا گیا۔

شادی کے چوتھے سال اللہ نے معصومہ کی سن لی اور اسے ایک بیٹے سے نوازا۔لیکن یہ خوشی بھی اس کے غموں سے ہار گئی۔کیونکہ اب اس کے اور اسکے سسرال والوں کے درمیان صرف نفرت و حقارت کا رشتہ باقی تھا اور اس رشتہ میں اس کا شوہر بھی بندھ چکا تھا۔اسے

شادی کے چوتھے سال اللہ نے اُسے بیٹے سے نوازا

نہیں معلوم تھا اس سے نفرت کیوں کی جا رہی ہے؟ شاید اس لئے کہ اس نے یکے بعد دیگر تین بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔یا اس لئے کہ وہ خود ایک بیٹی تھی۔یا پھر اس کا جرم غربت تھا یا پھر وٹے سٹے کی کسوٹی پر لٹکنا اس کے مقدر میں تھا۔جو بھی تھا اسے نصیب سمجھ کر قبول کرنا تھا۔

معصومہ کا کہنا ہے کہ اس کا شوہر جب بھی اپنے ماں باپ سے فون پر بات کرتا تو اس کے بعد اس سے لڑائی لازمی کرتا تھا، کیونکہ اس کے ماں باپ اسے بیوی اور بیٹیوں کے خلاف بہکاتے تھے۔اس کی نند کے بھی اس کے ماں باپ اور بھائی سے جھگڑے رہتے تھے، اور

وٹے سٹے کی شادیوں کے بھیانک نتائج

ایک بڑی نند بھی اپنے سسرال میں خوش نا تھی، جس کا بدلہ اسے چکانا پڑتا تھا۔معصومہ کے ماں باپ کا خیال تھا کہ جب ان کی بیٹیاں اپنے سسرال میں خوش نہیں ہیں تو ان کی بہو کیسے ان کے گھر میں خوش رہ سکتی ہے؟ یہ جہالت کا قانون تھا جو ایسے گھرانوں کے لوگ خود مرتب کرتے ہیں۔اب معصومہ کا شوہر اسے مارنے بھی لگا تھا۔کبھی تو اس طرح جانوروں کی طرح پیٹتا کہ وہ بے سدھ ہو جاتی، اس کا منہ سوج جاتا اور دانتوں سے خون بہنے لگتا۔لیکن پھر اٹھ کر گھر کے کام کاج میں لگ جاتی اور شوہر کے لئے کھانا پکاتی۔یا پھر دوسرے گھروں میں کام کاج کے لئے نکل جاتی۔کیونکہ ان کے قانون کی کتاب میں یہ بھی تو لکھا ہے نا کہ شوہر کے گھر سے بیوی کا جنازہ ہی اٹھنا چاہیئے۔اسی لئے اب وہ جنازہ ہی بنتی جا رہی تھی۔

مالی حالات سے مجبور ہو کر معصومہ کے والدین نے کچھ رقم اس کے شوہر سے ادھار لی تھی جسے وہ وقت پر ادا نہیں کر سکے تھے۔اس رقم کے آنسو ادا کر رہے تھے۔وہ اکثر معصومہ سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔جسے ادا نا کرنے پر اسے خوب مارتا پیٹتا۔معصومہ اب اس مار پیٹ سے تنگ آ گئی تھی۔اور خدا کی رحمت کو بھی شاید اس پر ترس آ ہی گیا تھا۔معصومہ جس گھر میں ملازمت کرتی تھی اس کی مالکن کو معصومہ سے کافی ہمدردی ہوگئی تھی۔معصومہ انہیں باجی کہہ کر پکارتی تھی۔وہ اکثر اپنے حالات اپنی باجی کو بتاتی۔جس پر وہ معصومہ کو اس ظلم کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دیتیں۔لیکن اس بار تو پانی سر سے ہی گزر گیا۔رقم کی واپسی کے معاملے پر نا صرف یہ کہ

شادی یا بدلہ؟

اس کے شوہر نے اسے مارا بلکہ گھر سے بھی نکال دیا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے باجی ہی کے گھر میں پناہ لی۔ جبکہ اس کے شوہر ہی کے پاس تھے۔ باجی نے اس موقع پر نہ صرف یہ کہ اس کی مدد کی بلکہ اسے اپنی حفاظت کی خاطر اس ظالم شوہر سے علیحدگی اختیار کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ معصومہ اب خود بھی اس درندے کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ لہذا اس نے ہمت کی اور باجی کی مدد سے اپنے شوہر کے خلاف خلا کا مقدمہ درج کر دیا۔ ابھی تک اس کے شوہر کو نہیں معلوم تھا کہ اس نے کہاں پناہ لی ہوئی ہے، لیکن جیسے ہی اسے خلا کا نوٹس ملا تو وہ معصومہ کو تلاش کئے بغیر ہی بچوں کو لے کر اپنے گاوں چلا گیا اور وہاں جا کر اپنے ماں باپ اور دیگر لوگوں سے یہ کہا

کہ معصومہ کا کسی غیر مرد کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ گویا معصومہ کا جسم تو اس نے اپنی درندگی سے چھلنی کر ہی دیا تھا اب اس کے کردار کو بھی داغ دار کرنا چاہتا تھا۔

لیکن شکر ہے کہ معصومہ کے خاندان والے اس کے کردار کی پاکیزگی سے واقف تھے۔ حتیٰ اس کی نندوں نے بھی اپنے بھائی کے اس الزام پر کان نہ دھرے۔ معصومہ کے والدین بھی اپنی بیٹی کی تلاش میں کراچی نکل گئے۔ معصومہ کی والدہ کو اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ خود بھی باجی کے گھر ملازمت کر چکی تھی۔ لہذا باجی گھر پہنچ کر اپنی بیٹی کو سلامت پا کر اس کی والدہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دوسری جانب عدالت کی جانب سے اس کے شوہر کو عدالت میں پیشی کا حکم نامہ موصول ہوا لیکن وہ عدالت میں پیش نا ہوا۔ جب کئی بار نوٹس بھیجے جانے کے باوجود معصومہ کا شوہر عدالت میں پیش نہ ہوا تو عدالت نے معصومہ کے وکیل کی سفارش پر فیصلہ اس کے حق میں سنا دیا اور یوں اسے اس ظالم اور فریبی انسان سے ابدی نجات حاصل ہوئی۔ لیکن اب معصومہ کا دل اپنے بچوں کے لئے تڑپ رہا تھا۔ وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے اس کی والدہ اسے اپنے ساتھ گاوں لے گئی تھیں۔ وہاں جا کر اس نے سب کو اس کے شوہر کی حقیقت بتائی اور برادری کو جمع کر کے بچوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ لہذا ایک بار پھر اسے اپنے بچوں کے حصول کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ خانپور ہی کی عدالت میں اس کے والدین نے مقدمہ درج کروایا۔ اس بار پھر عدالت کی جانب سے معصومہ کے شوہر کو بچوں کو لے کر عدالت میں پیش ہونے کا حکم ہوا۔ لیکن ایسے احکامات تو اس شخص کے سامنے کوئی وقعت رکھتے ہی نا تھے۔ لہذا اس بار بھی وہ عدالت میں پیش نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ اس کا کوئی خوف تھا، شرمندگی یا پھر ڈھٹائی۔ آخر کار اپنے بچوں کی حصول کے لئے معصومہ کو تھانیدار اور پولیس کی نفری کے ساتھ جانا پڑا۔ جب معصومہ پولیس کے ہمراہ اپنے سسرال پہنچی تو اس کا سابقہ شوہر تو گھر میں تھا لیکن بچے نہیں تھے۔ لیکن وہیں محلے میں سے بچے مل گئے۔ اس موقع پر معصومہ کے سسرال والوں نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر خوب لڑائی جھگڑا کیا لیکن پولیس کی مدد سے معصومہ اپنے تینوں بچوں کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔ اور عدالت نے بھی بچے ماں کی تحویل میں دینے کا فیصلہ سنا دیا۔ یوں معصومہ ایک بار پھر اس ظالم سے جیت گئی تھی۔ اس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے بعد معصومہ واپس اپنے بچوں کو لے کر کراچی آگئی۔ باجی کے گھر میں دوبارہ ملازمت شروع کی اور ان ہی کی مدد سے علاقے

معصومہ کا شوہر اُسے جانوروں کی طرح پیٹتا

کے کچھ اور گھروں میں بھی کام کرنے لگی۔ باجی اور دیگر خواتین نے مل کر معصومہ کے بچوں کو پرائیویٹ اسکول میں داخلہ کروایا۔ اور ان کی فیس ادا کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے یونیفارم اور کاپی کتابوں کا بھی بندوبست کیا۔ معصومہ نے تو اپنی زندگی دوبارہ شروع کر دی لیکن دوسری جانب اس کا سابقہ شوہر شدید بیمار رہنے لگا، اسے فالج کا اٹیک ہوا جس کی وجہ سے وہ بستر پر لگ گیا۔ اب وہ عبرت کا نشان بنا ہوا تھا۔ وہ بہت شرمندہ بھی تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اکثر رو رو کر اپنے بچوں اور معصومہ کو یاد کرتا اور اللہ سے معافی مانگتا۔ لیکن اس کے یہ آنسو اس کے گناہ کی تلافی نہیں کر پا رہے تھے۔ آخر کار اسی اذیت میں وہ جان کی بازی ہار گیا۔ اس کے انتقال کے بعد معصومہ کے سسرال والوں کو بھی اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس سے قبل تو کئی بار انہوں نے کراچی میں رہنے والے دیگر رشتے داروں کے ذریعے معصومہ کے کردار کی تفتیش بھی کروائی تھی۔ لیکن جس کا نام ہی معصومہ ہو وہ کیونکر اتنی شاطر اور بدکردار ہوسکتی تھی۔ وہ تو پاکیزہ تھی۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملنے پر اس کے سسرال والے اپنے رویے پر بہت شرمندہ تھے۔ اپنی شرمندگی اور گناہ کے بوجھ سے نکلنے کے لئے اب وہ معصومہ اور اس کے بچوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اس کا اور بچوں کا حق دینے کے لئے انہوں بڑی منت سماجت کر کے معصومہ کو گاوں آنے پر آمادہ کیا۔ وہاں ان کا اپنا گھر بھی ہے اور باپ کی جائیداد میں حصہ بھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد معصومہ اپنے بچوں کو لے کر گاوں جانے پر آمادہ ہوگئی۔ لیکن اس بار وہ بہت باہمت ہے۔ اسے جاتے وقت کوئی ڈر یا خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ اب وہ اپنے اور اپنے بچوں کے حق کے لئے زمانے بھر سے لڑنا اور سب کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہنا سیکھ گئی ہے۔ اس نے یہ بھی عہد کیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔ اور اب کے شادی بھی وٹے سٹے کی جاہلانہ رسم کے مطابق نہیں کرے گی۔ اس کے اس بدلاو میں اس کی باجی اور ان تمام نیک خواتین کا بھی پورا ہاتھ ہے جن کے گھروں میں معصومہ کام کیا کرتی تھی۔ کیونکہ انہوں نے نا صرف یہ معصومہ کی کٹھن گھڑی میں مالی مدد کی تھی بلکہ اسے ظلم کے خلاف لڑنا بھی سکھایا تھا۔ انسانیت زندہ ہی ایسے لوگوں کی وجہ سے ہے۔ یہ خواتین یقینا خراج تحسین کی مستحق ہیں۔ اب معصومہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کے حق کے حصول کے لئے بے خوف وخطر واپس اپنے گاوں جا چکی ہے۔ کیونکہ اب وہ صنف آہن ہے۔

اطراف کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اہم مسائل پر اطراف کے مستقل خریداروں اور عام قارئین کی رائے معلوم کر کے ہر مہینے عالمگیر سروے شائع کرتا ہے۔شوال کے مہینے میں عام طور پر شادیاں، منعقد ہوتی ہیں۔اور اس نئی پرانی رسمیں پوری کی جاتی ہیں۔اس سلسل میں عام پاکستانی اور سمندر پار پاکستانی خواتین و حضرات کیلئے سوال نامہ مرتب کیا گیا ہے۔اب بھی اس کا جواب دے سکتے ہیں۔

اپنے اپنے شہر کی شادی رسومات اور تقریبات سے آگاہ کریں

عام پاکستانیوں کے لیے سوالات

10اپریل ۔ہر ماہ کی طرح ""اطراف مئی"" میں بھی عالمگیر سروے کیا جارہا ہے۔شوال شادیوں کا مہینہ ہے اس لیے اپنے شہر میں شادیوں کے حوالے سے سوالات کے جوابات دیجئے اور معلومات اپنے شہر اپنے علاقے اپنے خاندان تک محدود رکھیں۔

1.شادی کے لیے سب سے پہلے بات پکی کیسے ہوتی ہے

2۔منگنی سادہ یا کوئی باقاعدہ تقریب گھر میں یا ہال میں ہوتی ہے

3.منگنی کے بعد کیا رسوم اور کیا کیا تقریبات منعقد ہوتی ہیں

4.نکاح کی تقریب مسجد میں ہوتی ہے یا گھر میں یا ہال میں۔نکاح خوان کا انتخاب کیسے۔

5.منگنی کے بعد لڑکے لڑکی کو آپس میں ملنے دیا جاتا ہے۔ان کو فون پر واٹس ایپ پر رابطہ کرنے دیا جاتا ہے۔

6.شادی کزنز میں کرنے سے پہلے کیا کوئی میڈیکل چیک اپ وغیرہ ہوتا ہے

7.شادی کیا رشتہ داروں سے باہر بھی ہوتی ہے۔

8.لڑکے لڑکی کو اپنی مرضی کی شادی کی اجازت ہے۔

9.شادی کا دعوت نامہ کتنا مہنگا ہوتا ہے۔کتنی تقریبات کے کارڈ چھپواتے ہیں۔شادی کی دعوت خود جا کر دیتے ہیں یا کارڈ پر بھی

منگنی کے بعد لڑکے لڑکی کو کیا آپس میں ملنے دیا جاتا ہے؟

10.زیادہ تر شادیاں میرج ہال میں ہوٹل میں گھر میں یا گلی میں شامیانہ لگا کر۔

11.شادی میں کیا کیا ضروری بنیادی امور پیش نظر رکھے جاتے ہیں

12.متوسط طبقے میں شادی کے کل اخراجات کہاں تک ہوتے ہیں

13.امیر گھرانوں میں ایک شادی پر کل کتنے اخراجات۔

14.نکاح کا جوڑا کتنے کا شادی کا جوڑا کتنے کا دلہا دلہن دونوں کا بتایئے۔

15.گھر میں سب سے زیادہ حکم کس کا چلتا ہے دادا نانا باپ ماں

16.حق مہر زیادہ سے زیادہ کتنا اور کم سے کم کتنا۔

17.جہیز کی پابندی کتنی ہے کیا جہیز کے بغیر بھی شادی ہوسکتی ہے

18.اپ کے شہر میں شادیوں کی کامیابی کی شرح۔

19.آپ کے شہر میں طلاق کی شرح کتنی

20.اپ کے ہاں اس مہینے کوئی شادی ہونے والی ہے اور اس کی کیا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ان سوالات کے علاوہ بھی آپ کوئی معلومات ضروری سمجھتے ہوں تو وہ بھی الگ سے لکھ دیں۔

سمندر پار پاکستانیوں کی شادی تقریبات

اطراف عالمگیر سروے.............................آخری تاریخ10اپریل2025----------

1.خاندان میں کسی شادی کے لیے کیا پاکستان آنا پڑتا ہے یا وہیں ساری تقریبات ہوسکتی ہیں2.شادی کسی ہوٹل میں یا ہال میں 3.نکاح اور ولیمے کے علاوہ بھی کوئی تقریبات ہوتی ہیں4.لڑکا لڑکی پاکستان سے ہی یا کسی اور ملک سے بھی ہوتے ہیں5.لڑکا لڑکی اگر پہلے سے مسلمان نہیں ہیں تو کیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں6.شادی کے جوڑے پاکستان سے بن کراتے ہیں دلہا دلہن کے یا مقامی طور پر تیار ہو جاتے ہیں7.تقریب میں مہمان صرف پاکستانی ہوتے ہیں یا مقامی غیر مسلموں کو بھی بلایا جاتا ہے8.شادی کی رجسٹریشن کا کیا طریقہ کار ہے9.نکاح خواں کا انتظام کیسے ہوتا ہے10.تقریب اگر پاکستان میں ہے تو کیا سمندر پار سے رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے 11 تقریبا اگر بیرون پاکستان ہے تو پاکستان سے کتنے رشتہ داروں کو مدعو کیا جاتا ہے12.شادی کا دعوت نامہ پاکستان میں چھپوایا جاتا ہے یا مقامی طور پر چھپ سکتا ہے13.شادی کا دعوت نامہ کیا ویزے کے حصول میں مددگار ہوتا ہے14.شہریت حاصل کرنے کے لیے کی گئی شادیاں کتنی دیر جاری رہتی ہیں یا ویزے کے حصول کے بعد ختم کر دی جاتی ہیں15.شادیوں میں کیا مقامی رسمیں بھی شامل ہو رہی ہیں16.سمندر پار جہیز کی شرائط کیسے پوری کی جاتی ہیں17.کتنے فیصد پاکستانی گھرانے لڑکی کو اپنی مرضی سے کسی مقامی لڑکے سے شادی کی اجازت دینے لگے ہیں۔؟

ان نکات کے علاوہ بھی آپ جو ضروری سمجھیں ان پر اظہار ضرور کریں اپ خود بھی اس کے جوابات کے لئے وقت نکالیں اپنے دوست احباب سے بھی کہہ سکتے ہیں۔

وٹس اپ کیلئے نمبر 0300-8210636

آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

طارق محمود مرزا آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ لیکن دل پاکستان میں دھڑکتا ہے کئی کتابوں کے مصنف ہیں نوائے وقت اور کئی دوسرے اخبارات میں اپنے ضمیر کی آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ "اطراف" کے لیے ان سے درخواست کی گئی تو اپنی ایک مختلف تحریر سے نوازا۔ انسان کو امن کی محبت کی ضرورت استنبول کے قیام میں ان کے ذہن میں کشمکش رہی اس کا دل نشیں بیان پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

انسان کیا چاہتا ہے زندگی یا موت۔۔۔۔۔۔؟

طارق محمود مرزا - سڈنی
tariqmmirza@hotmail.com

استنبول میں میرا ہوٹل شہر کے مرکزی علاقے فتیح میں واقع تھا۔ ائرپورٹ سے ہوٹل تک کا سفر تقریباً ایک گھنٹے کا تھا جس میں برق رفتار موٹروے، عام سڑکیں اور گنجان آبادی اور بازار تھے۔ اس دوران ہم بحیرہ فاسفورس کے اوپر بنے طویل پل پر سے گزرے اور پھر ایک بلند فصیل کے اندر بنے محرابی راستے سے گزرے۔ صدیوں پرانی سرخ اینٹوں سے بنی یہ دیوار دور تک چلی جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ دیوارِ قسطنطنیہ ہے۔ قسطنطنیہ استنبول کا پرانا نام ہے۔ یہ تاریخی شہر کئی قدیم تہذیبوں کا مرکز رہا جس میں یونانی، رومن، مشرقی رومن اور عثمانیہ سلطنت شامل ہیں۔ یوں اس شہر نے کئی عروج و زوال دیکھے۔ کئی بار اُجڑا اور آباد ہوا۔ میرے ہوٹل کے سامنے سینہ تانے کھڑی تقریباً دو ہزار سال پرانی فصیل ان تہذیبی انقلابوں کی گواہ ہے۔ اس فصیل نے صدیوں تک شہر کی حفاظت کی اور اُسے بیرونی حملہ آوروں سے بچائے رکھا۔ پائیدار اینٹوں والی اس دیوار کا جلال اور جمال اب بھی دیدنی ہے۔ لیکن! اس دیوار کی بنیادوں میں کتنے انسانوں کا خون جذب ہے اور ان کی ہڈیاں دفن ہیں۔ یہاں کشتوں کے پشتے لگے ہوں گے۔ کتنے سر نیزوں پر چڑھے ہوں گے۔ کتنے سہاگ اُجڑے ہوں گے۔ کتنے بچے یتیم ہوئے ہوں گے۔ ان اندھی اینٹوں نے خون کی کتنی ندیاں بہتی دیکھی ہوں گی۔

کیا شانِ خامشی ہے اینٹیں بھی بولتی ہیں
رُودادِ رفتگاں کے اوراق کھولتی ہیں

دیوار قسطنطنیہ کے سامنے ہوٹل کے صحن چمن میں بیٹھ کر میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ دو متحارب افواج اس سرو قد فصیل کے آر پار مورچہ زن ہیں۔ بیرونی حملہ آور فوج کیل کانٹے سے لیس اس دیوار کو پامال کرنے اور شہر پر قیامت ڈھانے پر کمر بستہ ہے جبکہ اندرونی فوج اور عوام اپنی بقا کی جنگ لڑنے اور حملہ آوروں کو ہزیمت دینے کے لیے کوشاں ہے۔ ان جنگوں، فتوحات، شکست اور مرنے والوں کی تعداد کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں کسی حد تک مل جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کئی معاملات میں خاموش ہے۔ مؤرخ ہمیشہ فاتحین اور مفتوحین کا ذکر کرتے ہیں مگر متاثرہ دور کے عوام الناس، عورتوں، بچوں ضعیفوں، باپوں، ماؤں اور دیگر معصوم لوگوں پر جنگ کے اثرات کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اس غارت گری سے جو نسلیں معدوم ہوتی ہیں جن کی ہڈیاں بے نام قبروں کی شکل میں رزقِ خاک بنتی ہیں، تاریخ ان کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ تباہ کن جنگوں کے دوران لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کیا ہوتی ہے طویل جنگوں میں موت و زیست کے درمیان معلق رہ کر پروان چڑھنے والی نسلیں کس کرب و اذیت سے گزرتی ہیں اور ان کی ماؤں کے دِلوں پر دن رات کیسے چھریاں چلتی ہیں۔ یہ مناظر تاحیات ڈراؤنے خواب بن کر کیسے ذہنی اذیت کا باعث بنتے ہوں گے۔ اس غارت گری کے منفی اثرات اگلی نسلوں پر کیسے منتقل ہوتے ہیں۔۔ ان حقائق کو جاننے کے لیے الگ تحقیق اور تاریخ مرتب ہونی چاہیے۔ جب سے انسان دُنیا میں آیا اس نے

جنگ سے کتنی نسلیں معدوم ہو جاتی ہیں۔۔۔۔

سب سے زیادہ نقصان اپنی ہی نسل کا کیا ہے۔ جنگوں کی تباہی اور بربادی کا یہ سلسلہ کسی دور میں نہیں رُکا۔ گویا بنی نوع انسان نے اپنی ہی نسل کو ختم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا۔ یہ قدرت کی نوازش ہے جس نے نسلِ انسانی کو معدوم نہیں ہونے دیا ورنہ کئی قوموں نے دوسری قوم کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی۔ جس میں خود میرا افوری ملک آسٹریلیا شامل ہے جہاں آبائی باشندوں کی منظم نسل کشی کی گئی۔ نسل کشی کی یہ مہم ختم ہوئے ایک صدی سے اُوپر ہو گئی لیکن اس کے اثرات اب بھی نمایاں ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے آبائی باشندے معاشی، سماجی، ذہنی اور نفسیاتی طور پر ابھی تک سنبھل نہیں پائے۔ ان کی نسلیں اس ٹراما سے گزر رہی ہیں۔ دوسری طرف انسان نے تکنیکی، طبی اور سائنسی طور پر اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایسی بیماریوں کا بھی علاج دریافت کرلیا ہے جو دو عشرے قبل تک ناقابل علاج تھیں اس تحقیق، علاج معالجہ اور دواؤں پر جو خرچ رقم خرچ ہوتی ہے اس کا بھی کوئی شمار نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس سے کہیں زیادہ بڑی رقم انسان کو لقمہِ اجل بنانے پر خرچ ہو رہی ہے۔ ایک بم سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی جان لے لیتا ہے اور سینکڑوں ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق دُنیا کے ساٹھ فی صد لوگ جنگ، جرائم اور جارحیت سے سہم کر زندگی گزارتے ہیں ان میں سے کچھ راتوں میں سو نہیں سکتے اور کچھ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ اس خوف کی وجہ کوئی خلائی مخلوق نہیں بلکہ انسان ہے جو خود کو مہذّب کہتا ہے۔ اتنا خوف و دہشت تو جنگل میں بھی نہیں ہوتا ہوگا جہاں درندے بستے ہیں۔ جنگل میں رہنے والے جانوروں نے بقائے باہمی کے کچھ اصول بنا رکھے ہیں۔ کم از کم وہ اپنی ہی نسل کو نہیں کھاتے۔ وہ شوق کے لیے بھی کسی کو شکار نہیں کرتے۔

آخر حضرت انسان چاہتا کیا ہے۔ زندگی یا موت۔ بقا یا فنا۔ ایک طرف زندگی بچانے کے لیے اتنی محنت، اتنی ریسرچ اور قیمتی دوائیں اور دوسری طرف ان ہسپتالوں کو بھی ملیا میٹ کر دیا جاتا ہے جہاں بیماروں اور زخمیوں کا علاج ہوتا ہے جس کی حالیہ مثال فلسطین کی ہے جہاں بچوں، مریضوں طبی عملے کو بھی نہیں بخشا گیا اور ہسپتالوں کو بھی

کتنی بڑی رقمیں انسان کو ہلاک کرنے پر خرچ ہو رہی ہیں

منہدم کر دیا گیا۔ دونوں طرف انسان ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ کچھ مسیحا بن کر زندگی بانٹ رہے ہیں اور کچھ ملک

اصول بقائے باہمی اسے انسانیت کے بلند مقام تک پہنچاتی ہے۔ آسٹریلیا، امریکہ اور دیگر کئی ملکوں میں ہر رنگ و نسل، مذہب،

دانش ہے، آگہی ہے، رابطے ہیں، ٹیکنالوجی ہے، سفر و حضر کی سہولتیں ہیں، ایک دوسرے سے شناسائی ہے، امن و شانتی کی اہمیت کا احساس ہے۔ آج انسان تعلیم یافتہ ہے اس کے سامنے صدیوں کا تجربہ ہے۔ لڑائیوں کے اسباب، واقعات اور انجام کی خبر ہے۔ جنگوں کی تباہ کاری سے آگاہ ہے۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ جنگ کسی

غزاہ میں اسرائیل کی بربریت سے عمارات کی تباہی کئی ہزار انسانوں کی ہلاکت پر ایک ماں آہ و فغاں کر رہی ہے

الموت بن کر موت تقسیم کر رہے ہیں۔ کچھ زخم دے رہے ہیں اور کچھ ان زخموں پر مرہم رکھ رہے ہیں۔ ہم ان دو انتہاؤں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی ہمارا جھکاؤ ایک طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔ کبھی ظالم کے مقاصد سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے اور کبھی مظلوم کی آہ دل کو تڑپاتی ہے۔ یہ کش مکشِ حیات ہے جو آغازِ آفرینش سے امتحان بن کر انسان کے قلب و ذہن میں جاری ہے۔ صدیوں کے تجربات کے بعد بھی آخر انسان بحیثیت مجموعی اپنے نفع نقصان کا، اپنی ترجیحات کا تعین کیوں نہیں کر لیتا۔ کیا

زبان اور ذات کے لوگ بقائے باہمی کے اصول کے تحت پُر امن زندگی بسر کرتے ہیں یہی اُصول بین الاقوامی سطح پر کیوں نہیں اپنایا جاتا۔ زبان، مذہب، فرقہ، ذات پات، رنگ اور علاقہ صرف پہچان تک محدود رہے تو مناسب ہے، اسے نفرت و عداوت کی وجہ بنا کر انسان، انسان کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ قدرت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اسے عقلِ سلیم دی ہے۔ اس عقل سے اس دنیا کو جنت نظیر بنا سکتا ہے۔ ایسی جنت جس میں بھوک، بیماری، دہشت اور موت کا خوف نہ ہو۔ کیا انسان اپنے لیے، اپنی نسل کے

مسئلے کا حل نہیں بلکہ بے شمار مسائل کی جڑ ہے۔ انسانیت کی قاتل ہے۔ جنگوں نے ہمیشہ موت، تباہی، بربادی، بھوک اور بیماریاں دی ہیں۔ ہمت ہے تو ان معاشرتی اور معاشی مسائل کے خلاف جنگ لڑو۔

انسان پر امن بقائے باہمی کے ذریعے دُنیا کو محفوظ و مامون بنا سکتا ہے جہاں کسی کو کسی کا خوف نہ ہو۔ قدرت نے انسان کو محبت کا انمول جذبہ عطا کیا ہے۔ فتح کرنا ہے تو دِلوں کو فتح کر۔ یہ دیرپا بلکہ دائمی فتح ہے۔

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

انسان جنگ کے بجائے امن کیلئے کوششیں کیوں نہیں کرتا........؟

انسان اس قابل بھی نہیں کہ صدیوں سے جاری اپنی ہی نسل کشی کا سلسلہ روک دے۔ کیا وہ اتنا بے بس ہے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے۔

انسان کی درست ترجیحات، اس کی انسان دوستی، امن پسندی اور

لیے اور اپنی بقا کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ دُنیا جسے گلوبل ولیج کہتے ہیں، جہاں اربوں انسان بستے ہیں، جہاں علم و ہنر ہے، عقل و

ماہنامہ اطراف کتاب کو اوّل و آخر بہت اہمیت دیتا ہے۔ جولائی 2014 سے کتاب کے فروغ کیلئے مسلسل کوششیں جاری رکھی ہیں۔ ہر کتاب میلے میں عملی طور پر اطراف نمائش گاہ میں موجود رہتا ہے۔ خان ظفر افغانی خود کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی ذاتی لائبریری میں کئی ہزار کتابیں ہیں۔ تذکرہ کتابوں کا اطراف کا ایک مقبولِ عام سلسلہ ہے افغانی صاحب ہر ماہ کتابیں کسی خاص شعبہ سے منتخب کرتے ہیں اس بار شعری مجموعے ان کا انتخاب ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے

سعید الظفر صدیقی کے شعری مجموعے

خان ظفر افغانی

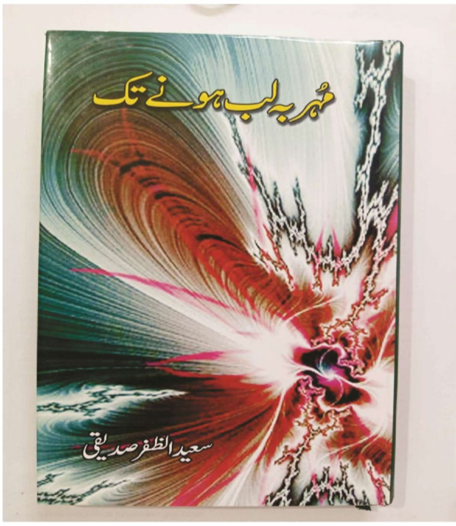

سعید الظفر صدیقی تین شعری مجموعے اور ایک کتاب انتخاب کلامِ اس وقت زیرِ تذکرہ ہیں۔ ''میرا صحرا مختلف ہے'' آئینہ نہیں کافی'' یہ مجموعہ غزل ہے، ''مُہر بہ لب ہونے تک'' میں غزلیں اور نظمیں ہیں۔ ''درد چھپا کر رکھا ہے'' انتخابِ کلام ہے جو 23 غزلوں پہ مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ جو شعری کُتب شائع ہو چکی ہیں وہ یہ ہیں:

''غبارِ راہ میں ہے''، ''جنوں پہ ہے بہار''، ''چوٹ دل کو دکھاتی نہیں''، ''محبت سنبھال کر رکھنا''، سعید الظفر کی تحریر کردہ کتاب جو سائنس و مذہب کے حوالے سے ہے ''ماورائے آب و گل'' شائع ہو چکی ہے ان کے فن و شخصیت کے بارے میں ''کتب شائع ہوئی ہیں، جو نازیہ ممتاز ملک اور ڈاکٹر مظہر حامد کی تحریر کردہ ہیں۔

''مُہر بہ لب ہونے تک'' 89 غزلوں و نظموں پہ مشتمل ہے۔ صفحات ہیں 92 قیمت 350 روپے، شائع کیا ہے، ماورا بکس (60۔ دی مال، لاہور) نے یہ شعری مجموعہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر آفاق صدیقی، رفیع الدین راز، سلمیٰ صدیقی، ڈاکٹر مظہر حامد اور ڈاکٹر محمد کامران کی آراء سے مرقع ہے۔ اس سے چند اشعار قارئین کے لیے:

وقت نے کیسی فصلیں کھینچ دی ہیں درمیاں
لوگ تنہا ہیں مگر احساس تنہائی نہیں

ہم اپنے سامنے اس کو سجا کے رکھتے ہیں
جو جام شیخ قبا میں چھپا کے رکھتے ہیں

اس بہروپ زمانے میں
جو کچھ ہے سب مایا ہے

دوستوں کے ہجوم میں رہ کر
دل ہوا ٹوٹ ٹوٹ کر تنہا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرحوم) نے اظہارِ رائے کیا کہ ''سعید الظفر صدیقی کے اشعار صاف بتاتے ہیں کہ ان کا تخلیق کار ایک با عزم و ہمّت اور صاحبِ کردار و حوصلہ شخص ہے۔''

''درد چھپا کر رکھا ہے'' سعید الظفر صدیقی کی غزلوں کا انتخاب جسے ''رنگِ ادب پبلی کیشنز (رومی سینٹر، اردو بازار، کراچی) نے شائع کیا ہے۔ سفید کاغذ مضبوط جلد کے ساتھ 256 صفحات کی اس کتاب کی قیمت ہے، 500 روپے اس کتاب میں، 123 منتخب غزلیں ہیں، مقدمہ پروفیسر یونس حسن (قصور) نے تحریر کیا ہے۔ کہ ''عصرِ حاضر کے جن شعراء نے اردو غزل کو ایک نیا اعتبار اور وقار بخشا اور اسے عصرِ جدید کی کروٹوں کا ترجمان بنایا، ان میں ایک قابلِ ذکر نام سعید الظفر صدیقی کا بھی ہے۔۔۔۔۔۔''

ان منتخب غزلوں میں سے ایک شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

اپنے قامت کو بڑھانے نہیں پائے تھے تو پھر
اپنے سائے کو تو قد سے نہ زیادہ کرتے

''آئینہ نہیں کافی'' غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اسے بھی ''رنگِ ادب پبلی کیشنز'' نے چھاپا ہے۔ یوسف فضل اور ڈاکٹر اختر ہاشمی کی آراء اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ صفحات ہیں 224 اور قیمت 400 روپے۔

یہ مجموعہ 110 غزلوں پہ مشتمل ہے۔ ان میں سے دو اشعار ہم نے منتخب کیے ہیں۔

راستے ختم اب ہوئے اپنے
ہم یہ کیوں سوچتے ہیں گھر آکر

جب سے میخانہ ہے، ساقی ہے نہ ساغر اپنا
سب سے ہم رکھتے ہیں اب حال چھپا کر اپنا

سعید الظفر صدیقی کی نظموں کے مجموعے کا نام ہے ''میرا صحرا مختلف ہے'' اسے کتابی شکل میں چھاپا ہے رنگ ادب پبلی کیشنز نے 160 صفحات کی کتاب ہے۔ قیمت ہے 300 روپے۔

نظموں کے اس مجموعے کے آخری صفحات دوہوں اور قطعات پر مشتمل ہیں۔

ایک دوہا ملاحظہ کیجئے:

چاول، دال، کنک سب تم نے کھیت میں اپنے بوئے
ماٹی میں بارود مِلا ہے فصل کہاں سے ہوئے

اور ایک قطعہ بھی

سفر کا ساتھ تو کہتے ہیں سب سفر تک ہے
جدا ہوئے تو کسے کون یاد آئے گا
سوال یہ ہے دل مضطرب کا کیا ہوگا
بدن تو ہجر کے صدموں کو جھیل جائے گا

تذکرہ کتابوں کا

کتاب کی دو جلدیں بھیجئے۔ کتاب گذشتہ ایک دو ماہ میں ہی شائع ہوئی ہو۔ کتابیں زیادہ آتی ہیں۔ اس لیے تذکرے میں دیر لگ سکتی ہے (ادارہ)

یاسمین بخاری کے شعری مجموعے

لوگ ایسے بھی بدل جاتے ہیں
دیکھتی ہوں اُسے حیرانی سے
یاسمینؔ ہم نے تو کاروبارِ دنیا میں
جِس سے بھی بھلائی کی اُس سے ہے بُرا پایا

یہ اشعار، معروف شاعرہ یاسمین بخاری (یاسمین ریاض شاہ) کے ساتویں مجموعہ کلام ''رقصِ شاعری'' سے ہم نے منتخب کیے موصوفہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ہی پینٹر بھی ہیں اور اپنی کتابوں کے سرورق، انھوں نے اپنی پینٹنگز سے سجائے ہیں۔ یہ پینٹنگز بہت دل کش ہیں۔

اُن کے فن کے بارے میں خالد عظیم لکھتے ہیں کہ ''یاسمین بخاری شعری دنیا میں کوئی نیا نام نہیں۔ زیرِ نظر مجموعے سے قبل ان کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان سب میں ان کی خاص پہچان غزل گوئی ہے۔ تاہم شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ان کی زیادہ تر پہچان مصوّری تھی۔ یہ محض ان کا مشغلہ نہیں بلکہ مصوری کے فن کو انھوں نے بہت اعلیٰ درجے پر اختیار کیا ہے اور اس اعتبار سے ان کے مصورانہ فن پارے مقبولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مصوری کے ساتھ ساتھ شاعری میں ان کی تخلیقی صلاحیت لائق اعتبار بھی ہے اور اُن کے فکری رجحانات کی بعض اہم خصوصیات کے ساتھ ان کی غزل میں ان مصورانہ مہارت بھی کار فرما ہیں۔۔۔''

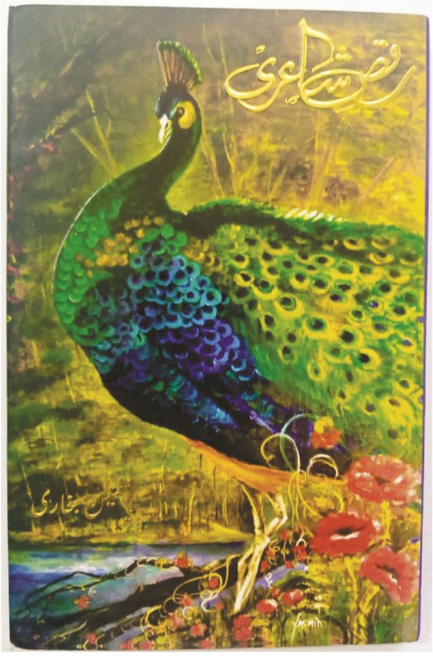

اس مجموعے کا فلیپ زاہد شمسی نے تحریر کیا ہے۔ 160 صفحات کی اس کتاب میں 70 غزلیں اور نظمیں ہیں۔ دبیز آرٹ پیپر پر اس کتاب کو ''آرٹ اینڈ لائف پبلشنگ ہاؤس (پتہ درج نہیں ہے) نے نفاست سے شائع کیا ہے۔ اور قیمت ہے 600 روپے۔

یاسمین بخاری کا پہلا شعری مجموعہ ''جگنو تتلی، پھول اور تارے'' کے نام سے 2014ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ''حرفِ رقصاں'' 2015ء میں، تیسرا ''رقصِ پنہاں'' 2016ء، چوتھا، ''رقصِ آ گہی'' 2018ء میں، پانچواں ''رقصِ خوشبو'' 2018ء میں اور چھٹا مجموعہ ''رقصِ خامشی'' 2020ء میں شائع ہوا۔

اِن سات شعری مَجموعوں میں حمد، نعتیں، قطعات، غزلیں نظمیں جمع کی گئیں یاسمین بخاری کے شعری مجموعوں سے منتخبہ چند اشعار قارئینِ اطراف کی پیشِ خدمت ہیں:

کیسی رُت سے نہ موسموں سے پوچھ
گُل کی خوشبو کا تتلیوں سے پوچھ

آئینہ ہے مرے طواف میں اب
تیرے سانچے میں خود کو ڈھالا ہے

لہجہ ہے اُس کا شہد سا الفاظ پھو سے
جادوگری ہے جس میں وہ اسیا خطیب ہے

ہر قدم راہ میں بکھرے تھے جواہر لیکن
میں ترے نقشِ کفِ پا کو اُٹھا لائی ہوں

شگفتہ قلم اٹھا کر انھیں از سرِ نو کوچہ دلداری و کوچہ دوام بخشا ہے۔ اس تصنیف میں شامل تمام مضامین قاری کو اولین فرصت میں اپنی جانب متوجہ کرتے اور دعوتِ فکر و مطالعہ دیتے ہیں''

رانا خالد محمود قیصر کی نثری و شعری کُتب

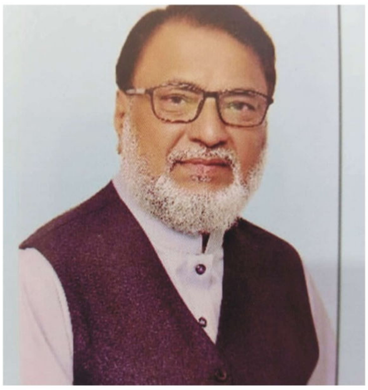

رانا خالد محمود قیصر شاعر ہیں، نثر نگار ہیں ان کی اب تک تقریباً پندرہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ جس میں سے چار کتابیں ہمارے سامنے ہیں جو ایک ہی برس میں طبع ہو کر قارئین تک پہنچی ہیں۔

معروف ادبی شخصیت اکرم کنجاہی کا کہنا ہے کہ ''رانا محمود قیصر شعر گوئی کے فنی تقاضوں سے واقف ایک عمدہ شاعر بھی ہیں۔ لہٰذا اُن کے ہاں جو فنی شعور ہے۔ وہ فن پاروں کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ رانا خالد نے شعرا اور شعری کتب پر زیادہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ مثبت سوچ کے تنقید نگار ہیں۔

''عکسِ اذہان'' رانا خالد کے مضامین و تبصرے پر مشتمل کتاب ہے جس میں چوبیس معروف قلمکاروں کی نگارشات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ 126 صفحات پہ مشتمل اس کتاب کی قیمت 400 روپے ہے۔

''عصری ادب اور تنقیدی رویے'' بھی مضامین اور تبصرے پر مشتمل ہے معروف شاعر ظفر محمد خان ظفر نے اظہارِ رائے کیا ہے کہ یہ رانا خالد محمود قیصر کے چالیس ادبی مضامین پر مشتمل معیاری و دلچسپ تازہ تصنیف ہے۔ جس میں مصنف نے قدرے قدیم اور جدید ادوار کے شعراء افسانہ نگاروں کے تعارف اور کلام پر اپنا

تذکرہ کتابوں کا

یہ کتاب 128 صفحات پہ مشتمل ہے اور قیمت ہے 500 روپے

''پرکار'' رانا خالد محمود قیصر کا شعری مجموعہ ہے جس کے بارے میں معروف شاعر محسن ملیح آبادی نے تحریر کیا ہے کہ ''یہ شاعری مجموعہ ایک سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام غزلیات بحرِ خفیف مسدس مجنبون مخدوف مقطوع میں ہیں۔ اس سے قبل بھی کسی ایک ہی بحر میں کہی گئی ایک سو غزلیات کے مجموعے دیگر شعراء کے آ چکے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان عام فہم ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک ہی بحر میں سو غزلیں کہنا بھی ان کی شاعرانہ حیثیت کو انفرادیت کا مقام عطا کرتا ہے۔''

''پرکار'' سے منتخبہ اشعار قارئین اطراف کے لیے:

وا کرو اپنے دل کا دروازہ
کوئی کہتا ہے روشنی کم ہے
رہنا دنیا میں ہے اگر تجھ کو
دنیا داری بہت ضروری ہے

اس شعری مجموعے میں سو غزلوں کے ساتھ دو نعتیں اور ایک قطعہ بھی ہے۔ صفحات ہیں 160 اور قیمت 400 روپے فلیپ اکرم کنجاہی نے تحریر کیا ہے۔ ظفر محمد خان ظفر پروفیسر سعید حسن قادری، پروفیسر شاداب احسانی اور ناز مظفر آبادی کی آرا کتاب میں شامل ہے۔

''نگاہِ صداقت'' حمد، نعت، قطعات اور 57 غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ جو محسن ملیح آبادی، سعید حسن قادری، اکرم کنجاہی، ڈاکٹر شاداب احسانی اور ڈاکٹر صدف انجم کی آراء سے مرقع ہے۔

رانا خالد حمود قیصر کے اس شعری مجموعے سے ان کے چند اشعار قارئین کے لیے:

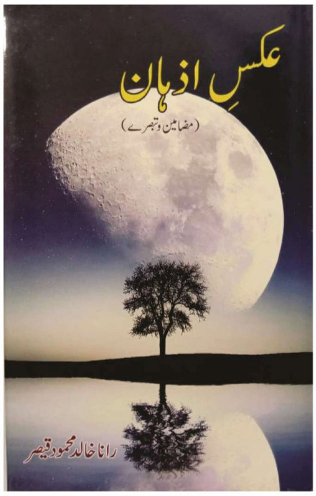

نگاہِ صداقت سے دیکھو
اک ہوں ہزاروں کی صف میں

کاش خود کو بھی دیکھے وہ اس میں
آئینہ سب کے پاس ہوتا ہے

کوئی اچھا مجھے نہیں کہتا
دیکھے کس قدر برا ہوں میں

خود نمائی سے مجھ کو نفرت ہے
تم سمجھتے ہو خود نما ہوں میں

تذکرہ کتابوں کا

اطراف کے اس قابلِ فخر سلسلے میں اردو میں تازہ ترین تصنیفات کا ذکر شامل کیا جاتا ہے اور کتاب کی افادیت سے آگاہ کیا جاتا ہے

برنس سینٹر کے زاہد سعید اور فرحان حنیف کی جانب سے دی گئی دعوت افطار میں کراچی کے معززین کا گروپ

شکریہ!۔۔۔۔۔سلک بینک

سلک بینک ۱۱/مارچ 2025 سے یو بی ایل ہو گیا ہے۔

''اطراف اور سلک بینک میں ایک تعلق کی خاطر دسمبر 2016 سے قائم ہو گیا تھا۔

ماہنامہ ''اطراف'' نے سلک بینک کی سرپرستی میں اردو کے ملک گیر فروغ میں نئے نئے منصوبوں پر کام کیا۔

نوجوانوں میں قومی زبان کے فروغ کے لے 2018 میں مضمون نویسی کے مقابلے شروع کیے گئے۔

یہ سب کچھ ایک دردمند پاکستانی ملک کے کئی بار وزیرِ خزانہ رہنے والے عالمی معیشت اور بینکاری کے ساتھ ساتھ آفاقی سیاسیات پر گہری نظر رکھنے والے جناب شوکت ترین کی ذاتی بصیرت کی بدولت تھا۔

مضمون نویسی کے مقابلوں میں بلوچستان، سندھ، پنجاب، جنوبی پنجاب اور خیبر پختونخوا کے 18 سے 28 سال تک کے نوجوانوں نے اور بالخصوص بیٹیوں نے بھرپور حصہ لیا۔

اوّل انعام ایک لاکھ روپے تک بھی دیا گیا۔

کراچی، لاہور کوئٹہ، پشاور، اسلام آباد کے ساتھ ساتھ لورالائی، میرپور خاص۔ رحیم یار خان، ملتان میں بھی تقسیمِ انعامات کی تقریبات منعقد کی گئیں۔

سلک بینک کی مہربانی کہ اردو کی اشاعت اور نوجوانوں کی تربیت کیلئے مسلسل دلچسپی لے کر ہر ماہ آخری صفحے کے اشتہار اور ہر مہینے اطراف کے کچھ نسخے اپنی برانچوں کے لیے بھی باقاعدگی سے جاری رکھے۔

2016 سے 2025 تک کی اس سائبانی پر اطراف کی انتظامیہ اور ملک بھر میں پھیلے۔ سمندر پار قارئین کی طرف سے سلک بینک کی انتظامیہ اور بالخصوص جناب شوکت ترین کا دلی شکریہ اور ممنونیت۔۔

[redacted]

”مہتاب علی پاکستان کے نامور مصور ہیں۔ اطراف کے موجودہ عورت نمبر کا سرورق بھی انہوں نے تخلیق کیا ہے۔ اطراف سے ان کا تعاون ہمیشہ قابلِ قدر رہا ہے۔ اطراف کیلئے یہ امر بھی انتہائی تسکین اور مسرت کا باعث ہے کہ مہتاب علی تمغۂ کراچی کیلئے منتخب کئے گئے۔ یہ یقیناً اُن کا حق تھا بلدیہ کراچی اس کے میئر مرتضی وہاب قابلِ تحسین ہیں۔ کہ انہوں نے پاکستان کے سب سے بڑے شہر کہ مختلف شعبوں میں کامیاب ہستیوں کیلئے تمغۂ کراچی کے اجراء کا لائقِ تقلید آغاز کیا ہے۔“

تمغۂ کراچی بلدیہ عظمیٰ کی جانب سے اعزاز

خان ظفر افغانی

بلدیہ عظمیٰ کراچی نے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کے حاصل افراد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ''تمغۂ کراچی'' بطور اعزاز دینے کا آغاز کیا ہے اس اعلان کے ساتھ کہ ہر سال اس طرح کے نمایاں افراد کو یہ اعزاز پیش کیا جائے گا۔ (اگر اس اعلان پر عمل ہوتا ہے تو یہ قابلِ قدر ہوگا)

اس سلسلے کی پہلی یا ابتدائی تقریب 5 جنوری 2025 کو کراچی

میں قائم قدیم عمارت ''خالق دینا ہال'' میں منعقد ہوئی جہاں میئر کراچی بیرسٹر مرتضیٰ وہاب نے مختلف شعبوں کے نمایاں افراد کو ''تمغۂ کراچی پیش کیا۔

مصوری کے شعبے میں معروف فنکار مہتاب علی کا انتخاب کیا گیا جن کے فن کی اندرون و بیرونِ ملک نمائشوں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔

''تمغۂ کراچی'' کا اعزاز حاصل کرنے پر مہتاب علی سے ہم نے انھیں مبارکباد دیتے ہوئے سوال کیا کہ ''آپ کو کب اور کیسے پتا چلا کہ اس اعزاز کے لیے منتخب ہوئے ہیں؟''

ان کا کہنا تھا کہ میں لاعلم تھا۔ اس تقریب سے دو روز پہلے میرے موبائل فون پر سرکاری نمبر سے کئی کالز آئیں جو میں اٹینڈ نہیں کرسکا۔ پھر واٹس ایپ پر مطلع کیا گیا کہ اتوار (5 جنوری) کو خالق دینا ہال پہنچنا ہے آپ کو بلدیہ اعزاز کے جانب سے ''تمغۂ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

KARACHI METROPOLITAN CORPORATION

جناب مہتاب علی

اعزاز: ''تمغۂ کراچی''

شعبہ: مصوری

مصور و خطاط جناب مہتاب علی ایک پروفیشنل آرٹسٹ ہیں انہوں نے اپنے فنی کیریئر کا آغاز 1982ء میں کیا اور جامعہ کراچی سے بیچلر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی، جناب مہتاب علی گزشتہ چار عشروں سے آرٹ کے شعبے میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں، ملک میں اور بیرون ملک، انفرادی اور اجتماعی نمائشوں میں ان کا کام توجہ اور شہرت حاصل کرتا رہا ہے، انہوں نے آرٹ کے شعبے میں خود اپنی الگ شناخت بنائی اور مسلسل محنت اور لگن سے مصوری اور خطاطی کی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے، کراچی، لاہور کے علاوہ امریکہ اور جرمنی میں بھی ان کی پینٹنگز کی نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں، برونائی کے شاہی خاندان کی پورٹریٹ بنانے کے لئے انہیں خصوصی طور پر منتخب کیا گیا اور ان کی بنائی ہوئی پورٹریٹ برونائی کے شاہی محل میں آویزاں ہے، حال ہی میں سندھ اسمبلی کی نئی عمارت کی تعمیر کے موقع پر انہیں اس عمارت کے اسمبلی ہال کے لئے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا پورٹریٹ بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کی پینٹنگز فیوچر ورلڈ فاؤنڈیشن امریکہ، کراچی جم خانہ، اسلامک سینٹر واشنگٹن، جاپان فاؤنڈیشن ٹوکیو، آئی بی آئی ایس ہوٹل پیرس، ریجہ کیسل جرمنی اور پاکستان ایئرفورس میس کی زینت بنی ہیں۔

مصوری کے شعبے میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں میئر کراچی نے جناب مہتاب علی کو تمغۂ کراچی کا اعزاز عطا کیا ہے۔

(بیرسٹر مرتضیٰ وہاب)
میئر کراچی

(ایس ایم ... زیدی)
میونسپل کمشنر

تاریخ: 5 جنوری 2025ء

کراچی'' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع میرے لیے بہت حیرت انگیز اور خوشی کا باعث تھی۔''

تمغہ دینے کی تقریب کی روداد بتایئے!

''جی میں اپنے بیٹے صداقت علی کو ساتھ لے کر ہال پہنچ گیا۔ اس تاریخی ہال میں پہلی بار میرا جانا ہوا۔ وہاں بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسٹیج کی پشت پر ''تمغۂ کراچی کا بینر آویزاں تھا۔ کئی ٹی وی چینلز والے آئے ہوئے تھے۔ وہاں بلدیہ کراچی کے ڈائریکٹر اطلاعات، معروف رائٹر اور ٹی وی نیوز ریڈر علی حسن ساجد صاحب موجود تھے۔ جن سے میری پرانی ملاقات ہے۔ بہت ملنسار شخص ہیں۔ خوب بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور مہمانوں کی سب سے اگلی نشست پر بٹھایا۔ تقریب کا آغاز ہوا تو رسمی کاروائی کے بعد سب سے پہلے میرا نام پکار کر اسٹیج پر بلایا گیا اور سامعین و

بسم اللہ الرحمن الرحیم

KARACHI METROPOLITAN CORPORATION

میں بحیثیت میئر کراچی

جناب مہتاب علی

کو مصوری کے شعبے میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں

تمغۂ کراچی

عطا کرتا ہوں۔

(بیرسٹر مرتضیٰ وہاب)
میئر کراچی

تاریخ: 5 دسمبر 2025ء

حاضرین کی طرف منہ کر کے مجھے کھڑا کیا گیا اور مائک پر میرے

آرٹ کے حوالے سے تفصیلی تعارف بیان کیا گیا۔ مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا شرم آرہی تھی اور ساتھ ہی خوشی بھی ہورہی تھی۔ پھر میرے لیے ''تمغۂ کراچی'' دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ میئر کراچی جناب مرتضیٰ وہاب نے پہلے مجھے سند پیش کی، سبز مخملی ڈبّہ لایا گیا اور اس میں سے تمغہ نکال کر میرے گلے میں پہنایا۔ یہ میرے لیے بہت خوشی اور فخر کے احساسات کا وقت تھا کہ ایک اہم سرکاری ادارے کی جانب سے مجھے اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا۔ برونائی کے بادشاہ اور ان کی فیملی ممبرز کے پورٹریٹس سندھ اسمبلی بلڈنگ میں لگی قائد اعظم کی پورٹریٹ اور دیگر نمایاں شخصیات کی میری بنائی گئی پورٹریٹس کا بیان کیا جانا۔ یہ سب کچھ میرے لیے بہت اہم اور قابلِ فخر ہے۔ اللہ نے مجھے عزّت سے نوازا نہ تو میں امراء کے طبقے سے ہوں اور نہ ہی وفاقی یا صوبائی حکومت میں میرا کوئی واقف کار۔

تقریب میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ بلدیہ عظمیٰ نے ''تمغہ کراچی'' دینے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اُس کی یہ پہلی تقریب ہے اور اب ہر سال مختلف شعبوں کے منتخبہ افراد کو تمغے دیئے جائیں گے اس تقریب میں مختلف شعبوں کے آٹھ نو افراد کو تمغے دیئے گئے۔ اس کے بعد پر تکلف عصرانہ دیا گیا۔ سرکاری سطح پر مجھے یہ پہلا اعزاز ملا ہے۔''

مصوری آرٹ گیلریاں اطراف کا خصوصی شعبہ رہی ہیں۔جولائی 2014 سے ہی خان ظفر افغانی نامور مصوروں سے بھی اور نئے مصوروں سے بھی متعاف کرواتے رہے ہیں۔معیاری مصوری نمائشوں کی روداد بھی قارئین تک پہنچاتے رہے ہیں۔اطراف واحد اُردو میگزین ہے جو مصوری کو ادب اور کتابوں کی طرح ہی اہمیت دیتا ہے۔عالمی یومِ خواتین پر خواتین مصوروں کے فن پاروں کی نمائش کا حال ملاحظہ کیجئے۔

عالمی یومِ خواتین، خواتین پینٹرز کی پینٹنگز کی نمائش

خان ظفر افغانی

عالمی سطح پر ہر سال منائے جانے والے ''یومِ خواتین'' کے موقع پر ہمارے ملک میں بھی مختلف اداروں اور تنظیموں کے زیر اہتمام مذاکروں، جلسوں اور تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے۔لیکن کراچی میں چار برسوں سے ایک ایسی تقریب منعقد ہوتی ہے جس کی پشت پر کوئی ادارہ ہے نہ تنظیم۔

یہ تقریب خواتین پینٹرز کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش ہے جو معروف پینٹر اور کیوریٹر ثمینہ ممتاز کی محنت لگن سے اور آرٹ سٹی گیلری (ڈی ایچ۔اے) کے تعاون سے Feminists Charisma V کے نام سے اس برس بھی منعقد ہوئی۔جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر محمد احمد شاہ (آرٹس کونسل کراچی کے صدر) اور چاند گل شاہ (چیئر پرسن۔اکیڈمیز کمیٹی آرٹس کونسل) کو بلایا گیا تھا۔

یومِ خواتین کی مناسبت سے یہ سالانہ پانچویں نمائش تھی۔ پینٹر

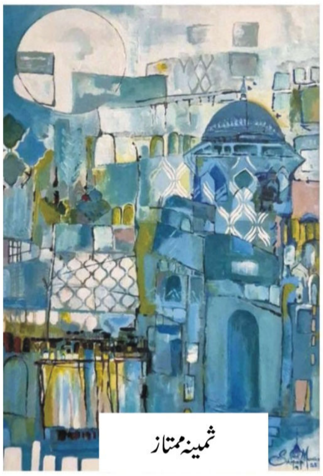

ثمینہ ممتاز

کوثر بھٹی

رباب نقوی

خواتین کا تعاون کیوریٹر سے اور آرٹ سٹی کا تعاون نمائش کے انعقاد میں۔ افتتاحی تقریب میں خواتین پینٹرز، مرد پینٹرز اور آرٹ کے شائقین کی بڑی تعداد موجود تھی۔

درجِ ذیل خواتین پینٹرز کی پینٹنگز نمائش میں پیش کی گئیں۔

افشین وقاص، آمنہ وقاص، انیقہ فاطمہ، انا الحق، ارسلا جاوید، عاصمہ بیگ، عذرا وہاب، فریحہ یوسف، فرحین کنول، فصیحہ فاروق، فوزیہ خان، فردوس صدیقی، گل وفا، حفصہ شیخ، کوثر بھٹی، لائبہ مقصود، مسرّت عارف، ناہید آفریدی، ناہید رضا، ندا فاطمہ سیّد، نوشی رند، رباب نقوی، رابعہ زبیری، رضیہ سحر، سعدیہ شاہد، صبیحہ نصر الدین، سعدیہ عارف، سحر شاہ رضوی، صائمہ عامر، ثمینہ ممتاز، ثناء نظام، شائمہ عمر، شائستہ مومن، شمی احمد، شازیہ سلمان، سدرہ ستار، سوہائنہ ایلیا، سنبل سجاد، سیّدہ کومل ظفر، سیّدہ نادیہ رضا، سید سبین راشد، عمائنا خان اور زینب تاج۔

نمائش کے اہتمام، انتظام اور کامیابی پر ثمینہ ممتاز بہت مسرور تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ عالمی یوم خواتین ہمیں خواتین کے عزم، ہمت، قوت اور تعمیری صلاحیتوں کے اظہار کے اُس سفر کی یاد دہانی کراتا ہے۔ جو تاریخ کا سفر ہے۔ آج اس نمائش میں خواتین فنکاروں نے اپنے فن کے ذریعے عورت کی آواز کو ان کی کہانیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان پینٹنگز میں عورت کی جدوجہد اور صلاحیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ویسے بھی آرٹ ہمیشہ سے سماجی وثقافتی ماحول، سماجی رویوں اور تبدیلیوں کے اظہار کا نہایت اثرانگیز ذریعہ رہا ہے۔ اس نمائش کو کیوریٹ کرتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے۔ اپنی سب قابلِ احترام آرٹسٹوں اور آرٹ سٹی گیلری سے اظہارِ ممنونیت کرتی ہوں۔

نوشی رند

سیدہ نادیہ رضا

فوزیہ خان

سوہائینہ ایلیا

ماہنامہ تخلیق 1969 سے پاکستان بھارت سمندر پار اردو کی بستیوں میں ادب کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اظہر جاوید سنیئر صاحفی تھے۔شاعر تھے خوبصورت نثر لکھتے تھے وہ 2014 میں دنیا سے اچانک اٹھ گئے ۔تو ان کے بیٹے سونان اظہر جاوید نے تخلیق کی مشعل کو بڑی عقیدت اور محبت سے ہاتھوں میں تھاما اور بہت ہی اہتمام سے تخلیق کی اشاعت جاری رکھی۔تخلیق ادبی ایوارڈ کا سلسلہ ادبی دنیا میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔اس سال 13ویں ادبی ایوارڈ کی تقریب بہت اہتمام سے منائی گئی۔سونان اظہر جاوید نے ہماری درخواست پر اس پُرلطف محفل کی روداد قلم بند کی ہے۔

13 واں تخلیق ادبی ایوارڈ
178 کتابوں کے مصنف ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے نام

تحریر:.................سونان اظہر جاوید

جنوری کا ماہ کسی بھی سال کا ہو میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیتا ہے اور بار بار ذہن میں یہ کشمکش شروع ہو جاتی ہے کہ فروری کے ماہ میں کوئی شخص ایسا بچھڑا کہ پلٹ کے نہ آسکا اور مجھے اس کی یاد کی شمع کو خونِ جگر سے جلائے رکھنا ہے یعنی ہمیشہ کی طرح اُن کی برسی اور یادوں پر مشتمل ایک ادبی محفل جس میں ان کے سب رفقا کو ایک چھت تلے یکجا کرنا ہے۔ 14 فروری 2012ء کو اظہر جاوید یوں تو دنیا سے چلے گئے لیکن سچ یہ ہے کہ وہ آج بھی اپنے چاہنے والوں کے قلوب میں زندہ ہیں۔ ان کا نام آج بھی فخر کے ساتھ نہ صرف پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا، ادبی محفلوں، یوٹیوب، فیس بک کی پوسٹ پر نمایاں ہے بلکہ محبتوں کا ایسا چشمہ ہے جس نے آج تیرہ سال کے بعد بھی ان کے تمام دوستوں کو اپنے سحر میں مبتلا کیا ہوا ہے۔فروری آتے ہی ادبی میلے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ کسی بھی بلند مقام پر پہنچ جانا مشکل ہے مگر اس معیار کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے۔ ہر آنے والے سال میں بزمِ تخلیق کا انعقاد ایک چیلنج بن جاتا ہے۔خصوصاً پچھلے پانچ برسوں میں منعقد ہونے والی تخلیق تقریبات کا معیار کسی بھی بین الاقوامی ادبی کانفرنس سے کم نہیں۔ ہر ادبی تقریب کی کامیابی کی پہلی ضمانت سجائی گئی مہمانوں کی سٹیج ہوتی ہے۔ 2024ء کی تقریب میں سٹیج پر محترم ڈاکٹر خورشید رضوی، محترم خالد اقبال یاسر، محترم ریاض حسین زیدی، محترم نذیر قیصر، محترم نسیمِ سحر اور محترم خالد شریف براجمان تھے جو کسی بھی آنے والی نئی تقریب کی سٹیج پر بیٹھنے والے مہمانوں کی صفِ اوّل کی نمائندگی کا تقاضا کر رہی تھی۔ اس معیار کو برقرار رکھنے کی خاطر سب سے پہلے صدارت کے لئے میرے ذہن میں محترم محمود شام کا نام آیا مگر دوسرے ہی لمحے خیال آیا کیوں کوئی ذاتی خرچ پر ہزاروں روپے لگا کر ایک ادبی پرچے کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لئے کراچی سے لاہور تک کا سفر کرے گا جبکہ عمر کا تقاضا بھی سفر کی اجازت نہ دیتا ہو۔ مگر اظہارِ تمنا کی قوت نے جرأت دی اور میں نے فون ملا دیا۔ سلام دُعا کے بعد مدعا عرض کیا تو اگلا لمحہ میرے لئے کسی حیرانی سے کم نہ تھا۔ محترم محمود

ماہنامہ تخلیق کا 13 واں ادبی ایوارڈ

مدعا عرض کیا تو اگلا لمحہ میرے لئے کسی حیرانی سے کم نہ تھا۔ محترم محمود شام نے انکار کرنے کے بجائے آنے کی اُمید دلا دی جو یقیناً لاہور کے ادبی حلقوں کے لئے کسی اہم اعزاز سے کم نہ تھا۔ فوراً خود کلامی کی کیفیت پیدا ہوئی کہ یہ تقریب بے شک پرانی تمام تقریبات سے زیادہ سپرڈوپر ہونے والی ہے۔ اس تسلی کے بعد اگلا اہم فیصلہ سٹیج پر مہمانانِ خصوصی کے انتخاب کا تھا جس میں قرعہ محترم نجیب جمال، محترم نذیر قیصر، محترم نصرت صدیقی، محترم ڈاکٹر ریاض مجید اور محترم سعادت سعید کے نام نکلا اور تیرہویں تخلیق ایوارڈ کے لئے محترم ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا نام پہلے ہی فائنل ہو چکا تھا۔ مگر ادبی پروگرام اور جوئے کی میز پر پڑی رقم کی تسلی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک رقم جیب میں چلی نہ جائے۔ کیا پتہ عین موقع پر کون دامِ اُلفت میں سے ایک معقول جواز دے کر اپنا دامن بچا لے۔ ہم تو ویسے بھی خود ساختہ جواز پیدا کرنے میں خود کفیل ہیں۔ ان تمام انتظامات کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے لئے سب سے پہلے ایک قابلِ اعتماد بورڈ کا انتخاب کیا گیا جس میں محترم خالد شریف، محترم ساجد حبیب، محترم حسین مجروح، محترم ڈاکٹر فیصل شہزاد، محترمہ تسنیم کوثر اور محترمہ سحر حفیظ کو نامزد کیا گیا۔ تقریب کو کامیاب اور یادگار بنانے کے لئے الیکٹرانک میڈیا چینل، پرنٹ میڈیا، فوٹو گرافر، یوٹیوبرز، وی لاگرز، شیلڈز جیسے پلیٹ فوموں کو استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا اور بیرون شہر سے آنے والے کثیر تعداد میں دوستوں سے 22 فروری بروز ہفتہ لاہور آمد پر اصرار کیا گیا تا کہ 23 فروری بروز اتوار تقریب کا انعقاد کیا جا سکے مگر 22 فروری کی رات ایک فون کال نے ذہنی طور پر سارے پلان کو منتشر کر دیا کہ محمود شام فرما رہے تھے تمام تیاری مکمل تھی مگر پرواز کینسل ہو گئی۔ ارشادِ باری ہے ''عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے''۔ محترم محمود شام کے حوصلے شاہین کی پرواز کی طرح بلند تھے۔ سوچتا ہوں اس مادہ پرستی کے دور میں کتنا آسان تھا کہ وہ حقیقی جواز کو مدنظر رکھتے ہوئے، آنے سے معذرت کر لیتے۔ میں دل و دماغ کی اسی کشمکش سوچوں میں گم تھا کہ چند گھنٹوں بعد آنے والی کال نے پھر سے اُمید ڈال دی۔ صبح ساڑھے نو بجے کی پرواز کی سیٹ بُک کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دعا کریں یہ پرواز خیر سے لاہور پہنچ جائے۔ بیٹے کی ذمہ داری لگائی کہ صبح کا سورج نکلے تو محمود شام اور ان کی اہلیہ کو ایئرپورٹ سے ریسیو کر لیں۔ میں چونکہ دیر سے سو کر اُٹھنے کا عادی ہوں۔ جب گیارہ بجے اُٹھا تو خلافِ توقع گھر میں چہل پہل تھی۔ خبر ملی محمود شام صاحب اور ان کی بیگم بلقیس بانو صاحبہ گھر پہنچ چکے ہیں۔ جلدی سے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام پیش کیا۔ تیاری کے بعد سب مل کر ایک بجے دوپہر آفوش کلب پہنچے جہاں آج ادبی میلے کا انعقاد تھا۔ ''تیرہواں تخلیق ایوارڈ'' اظہر جاوید کی یادوں اور

ملک بھر سے ادیبوں، شاعروں کی بھرپور شرکت

دُعاؤں کی محفل۔ ڈیڑھ بجے دوپہر تقریب کا وقت تھا مگر خلافِ توقع لوگ ایک بجے ہی پہنچنا شروع ہو گئے۔ دو بجے دوپہر تک ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ 135 لوگوں کو دعوت نامے بھجوائے گئے جن میں سے 102 لوگوں نے شرکت کی۔ سواد و پر کلامِ پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر فیصل شہزاد نے یہ سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موضوع پر گفتگو پاکستان کے صفِ اوّل کے سکالر طارق شریف پیرزادہ نے فرمائی۔ نظامت کی باگ ڈور میجر شہزاد نیئر اور ڈاکٹر فرحی امین کے ہاتھوں میں آئی۔ بیرونِ شہر سے آنے والے دوستوں کو اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ ڈاکٹر بدر منیر (خوشاب)، ناصر علی سیّد (پشاور)، شازیہ رباب (ملتان)، جبار مرزا (اسلام آباد)، نصرت صدیقی (فیصل آباد)، شہزاد بیگ (فیصل آباد)، عبدالرؤف کیانی (راولپنڈی)، شجاعت علی راہی (اسلام آباد)، طالب انصاری (راولپنڈی)، نسیم سحر (راولپنڈی)، سعدیہ سیٹھی (انگلستان)، قانع ادا (امریکہ)، صائمہ آفتاب (شیخوپورہ)۔ لاہور سے شرکت کرنے والے دوستوں کی کثیر تعداد تھی۔ محترمہ سلمیٰ اعوان، محترمہ بلقیس بانو، محترمہ فاطمہ قمر، محترم خاور اعجاز کنور، محترم حذیفہ سونان، محترم ضیا حسین، محترمہ ہما شیخ، محترم اکمل شہزاد، محترم شہزاد روشن گیلانی، محترم شارق احمد شارق، محترمہ حنا علی، محترمہ ورشا ما، محترمہ آبگینہ سونان، محترمہ کاوش صدیق، محترمہ شمسیلہ سعید، محترم اقبال بخاری، محترم چوہدری وقاص، محترم رضوان بٹ، محترمہ عابدہ، محترمہ ڈاکٹر نوشین خالد، محترم عنایت علی چوہدری، محترم محمد علی تبسم، محترم زاہد ندیم، محترمہ ثوبیہ طاہر، محترم انجم خلیق، محترم میثم عباس اور باقی تمام دوستوں کے نام شیلڈیں وصول کرنے یا دینے والوں میں آچکے ہیں۔ اس لئے صرف چند دوستوں کو اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ خالد شریف، بریگیڈیئر وحید الزمان، خالد محمود شامل تھے۔ اسی دوران عدیل برکی گلوکار، شاعر، ادیب نے اظہر جاوید کی غزل سنا کر تقریب میں ایک نئی روح پھونک دی اور سامعین جھوم اُٹھے۔ بہترین گلوکار کا ایوارڈ توقیر شریفی نے عدیل برکی کو شیلڈ کی صورت میں دیا۔ ساتھ ساتھ دوستوں کو ان کی ادبی خدمات اور خصوصی شرکت پر شیلڈیں پیش کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر بدر منیر کو ڈاکٹر محمد کلیم، ناصر علی سید کو طارق شریف پیرزادہ، شازیہ رباب کو سرفراز سیّد، نصرت صدیقی کو حبیب اکرم، عبدالرؤف کیانی کو ڈاکٹر فضیلت بانو، محترمہ نگہت جمیل کو عدیل برکی، طالب انصاری کو صائمہ آفتاب، قانع ادا کو مسرت کلانچوی، نصرت بخاری کو ممتاز راشد لاہوری، ڈاکٹر فرحت عباس کو شہباز انور، سعدیہ سیٹھی کو ڈاکٹر محمد رفیق خان، ندیم فراز کو حمید رازی، شجاعت علی راہی کو محمد جاوید اور شہزاد بیگ کو سلیم شہزاد نے شیلڈ پیش کیں۔ سال 2024ء کے بہترین افسانہ نگار کا ایوارڈ آصف عمران (لاہور) کو دیا گیا۔ جج عذرا اصغر اور ڈاکٹر عظمیٰ سلیم نے یہ ایوارڈ دیا۔ 2024ء کے بہترین مضمون نگار کا ایوارڈ سعادت سعید (لاہور) کے نام ہوا۔ جج جمیل احمد عدیل اور بابائے صحافت جمیل اطہر قاضی نے انہیں شیلڈ پیش کی۔ پورا سال تخلیق کے فروغ کے لئے خدمات ادا کرنے پر اظہر جاوید کے دیرینہ دوست طاہر منظور اور جاوید منظور کو ادب دوست کی شیلڈ امیر بہادر ہوتی نے اور خالد محمود کو حفیظ طاہر نے پیش کی۔ پھر نئی روایت کو قائم کرتے ہوئے، تقریب کے دوران پہلے مہمانانِ خصوصی کو اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ شیلڈیں پیش کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ محترم سعادت سعید کو شیلڈ غلام حسین ساجد نے پیش کی۔ محترم نذیر قیصر کو تخلیق ایوارڈ یافتہ حسن عسکری کاظمی نے شیلڈ پیش کی۔ ڈاکٹر ریاض مجید کو شیلڈ پروفیسر اعتبار ساجد نے پیش کی۔ نجیب جمال کو شیلڈ اقتدار جاوید نے پیش کی۔ اس کے بعد ساجد حبیب نے تخلیق کی تاریخ پر ایک مضمون پڑھ کر دریا کو کوزے میں قید کر دیا اور پھر انہوں نے مدیرِ تخلیق سونان اظہر جاوید کا لکھا ایک مضمون ڈاکٹر قیصر رفیق پر پڑھ کر خوب داد سمیٹی۔ بیرونِ ملک (امریکہ) میں تخلیق کے فروغ کی ادبی خدمات انجام دینے پر ڈاکٹر فوقیہ مشتاق کی شیلڈ ڈاکٹر ایوب ندیم نے وصول پائی۔ اس کے بعد مرحلہ تھا اس پروگرام کی کامیابی میں شانہ بہ شانہ شب و روز صرف کرنے والے تخلیق کو ہر طرح سے سپورٹ کرنے والے میرے ہمراز محترم ڈاکٹر قیصر رفیق جو آفوش کلب کے سی ای او ہیں اور پچھلی تیراں تقریبات سے مسلسل یہ ذمہ داری ہر سال بخوشی ادا کرتے ہیں کہ تمام پروگرام کے انتظامات کی ذمہ داری خود اپنی نگرانی میں انجام دیئے چلے آرہے ہیں۔ ڈاکٹر قیصر رفیق کو فروغِ ادب کی شیلڈ آج کی شام کے دولھا محترم محمود شام نے پیش کی۔ پھر تحائف کا تبادلہ ہوا۔ محمود شام نے سندھ کی روایتی چادر بطور نشانی مجھ فقیر کو پیش کی اور سعدیہ سونان نے ان کی زوجہ بلقیس بانو کو چند تحائف پیش کیے۔ اس کے ساتھ ہی اس پروگرام کے تمام انتظامات میں ادارہ تخلیق کا ساتھ دینے والی کمیٹی کے ارکان کی خصوصی کاوش پر محترم خالد شریف کو پروفیسر عبدالکریم خالد نے شیلڈ پیش کی۔ محترم ساجد حبیب کو بریگیڈیئر وحید الزماں نے شیلڈ پیش کی۔ محترم ڈاکٹر فیصل شہزاد کو سونان اظہر نے شیلڈ پیش کی۔ محترمہ تسنیم کوثر کو شیلڈ جبار مرزا اور خالد شریف نے پیش کی۔ محترمہ سحر حفیظ کو شیلڈ احمد صفی نے پیش کی۔ سواد و پر شروع ہونے والی یہ تقریب تقریباً شام کے ساڑھے پانچ بجے اپنے اختتام کی طرف گامزن تھی۔ چار گھنٹے تک ہال میں کامل انہماک کا عالم تھا اور نظامت کے اعلیٰ معیار نے کسی بھی شخص کو تقریب ادھوری چھوڑ کر جانے کی اجازت نہ دی پھر صاحبِ صدر محترم محمود شام کو اپنا مضمون پڑھنے کا موقع ملا تو انھوں نے طویل مضمون انتہائی خوب صورتی سے ادا کیا اور سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ انھیں صدارت کی شیلڈ ڈاکٹر قیصر رفیق نے پیش کی۔ اب مرحلہ تھا آج کی شام کا سب سے بڑا پاکستان کے ادبی ایوارڈ کو دینے کا، جس کے لیے اس ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ ''تیرھواں تخلیق ایوارڈ'' ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم (سرگودھا) کو یہ ایوارڈ محترم محمود شام، ڈاکٹر قیصر رفیق اور میں نے خود اپنے ہاتھوں سے پیش کیا۔ تمام ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ سرگودھا کی ادبی تاریخ میں آج ایک نیا اضافہ ہو گیا۔ اب باری تھی نظامت کی جس کی وجہ سے آج کی شام یادگار ہو گئی۔ میجر شہزاد نیئر کو اعلیٰ نظامت کی شیلڈ پروفیسر محمد طاہر صدیقی نے پیش کی اور ڈاکٹر فرحی امین کو معاون نظامت کی شیلڈ پروفیسر علامہ عبدالستار عاصم نے پیش کی۔ آخر میں مجھ فقیر کو اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ میں نے مختصر خطاب میں ''تخلیق'' کے تمام دوستوں کو جو انتظامی، مالی اور قلمی تعاون میں تخلیق کا ساتھ دیتے ہیں، شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کی سب سے خوب صورت بات کہ پہلی مرتبہ وقت پر شروع ہوئی اور آخر تک سامعین سے ہال بھرا رہا۔ خدا کا شکر ادا کرنے کے علاوہ تمام دوستوں کا دل سے شکریہ ادا کیا اور 14 ویں تخلیق ایوارڈ کے لیے اس سے بھی زیادہ بھرپور طریقے سے منعقد کرنے کا عہد لیا۔

آخر میں بہترین HI-TEA سے دوستوں نے خوب لطف اُٹھایا او تخلیق کے تابناک مستقبل کے لیے دعا کی۔ چھ بجے شام تک تقریب اختتام پذیر ہوئی اور بیرون شہر کے تمام دوستوں نے واپسی کی تیاری شروع کی مگر اس تقریب کے سحر اور خوشبو سے یہ تمام دوست پورا سال مستفید ہوتے رہیں گے!

لاہور میں تین دن

”لاہور ایک عرصے کے بعد ماہنامہ تخلیق کے ادبی ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کیلئے جانا ہوا۔ تو پروفیسر جاوید اقبال ندیم اور علامہ عبدالستار عاصم نے کچھ اور اداروں میں بھی تقریبات کا اہتمام کیا۔ اپنی مادر علمی گورنمنٹ کالج لاہور اور دوسری جگہوں پر بھی احباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔“

پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے باہر تنویر شہزاد عبدالستار عاصم
پروفیسر جاوید اقبال ندیم کے ہمراہ

وفاقی ٹیکس محتسب جناب ڈاکٹر آصف محمود جاہ کے دفتر میں چند لمحے اُنھوں نے اپنی کتاب بھی پیش کی
جناب علامہ عبدالستار عاصم اور حامد یزدانی بھی ہمراہ ہیں۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں مجلس اقبال کے زیرِ اہتمام سیمینار کے بعد طلبہ و طالبات اساتذہ کے ہمراہ ایک گروپ فوٹو جس میں ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر سفیر حیدر بھی نمایاں ہیں۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں شعبۂ فلسفہ کی سربراہ ثوبیہ طاہر اور اساتذہ کے ہمراہ

ہمدرد مرکز لاہور میں علی بخاری صاحب آڈیٹوریم کے بارے میں بتا رہے ہیں

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے سربراہ پروفیسر محمد جواد کو اطراف فروری شمارہ پیش کرتے ہوئے

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں طالب علموں اور اساتذہ سے تبادلہ خیال

Friends of
BURNS CENTRE

APPEAL FOR ZAKAT/DONATION

وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا
أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا

"Whoever saves a life, it is as if he had saved the lives of all mankind"
Surah Al-Ma'idah
(Quran:5:32)

Providing 100% free treatment for Burns Patients/Victims

THEY NEED YOUR MOST URGENT HELP

MEEZAN BANK LIMITED

Donation A/C # 0148-0100331344

Zakat A/C # 0148-0100331347

BANK ALFALAH LIMITED

Donation A/C # 0024-100[illegible]525

Zakat A/C # 0024-10026[illegible]526

For Information ✶ 0344-3333004 ✶ www.burnscentre.org

EMPOWER
HEALING
WITH YOUR
ZAKAT

PAKISTAN EYE BANK SOCIETY
PEBS
PEBS HOSPITAL

DONATION VIA BANK DEPOSIT

FOR ZAKAT
Meezan Bank Ltd.
PK97 MEZN 0099210102450686

FOR DONATION
Allied Bank Ltd.
PK10 ABPA 0010011795080021

FREE ORAL CANCER SURGERIES
Habib Bank Ltd.
PK29 HABB 000 7860079659003

DONATE ONLINE

ST - 19/7 , Sector 14B, Shadman Town , North Karachi
Info@pakistaneyebank.org.pk www.pakistaneyebank.org.pk 0213 6908053

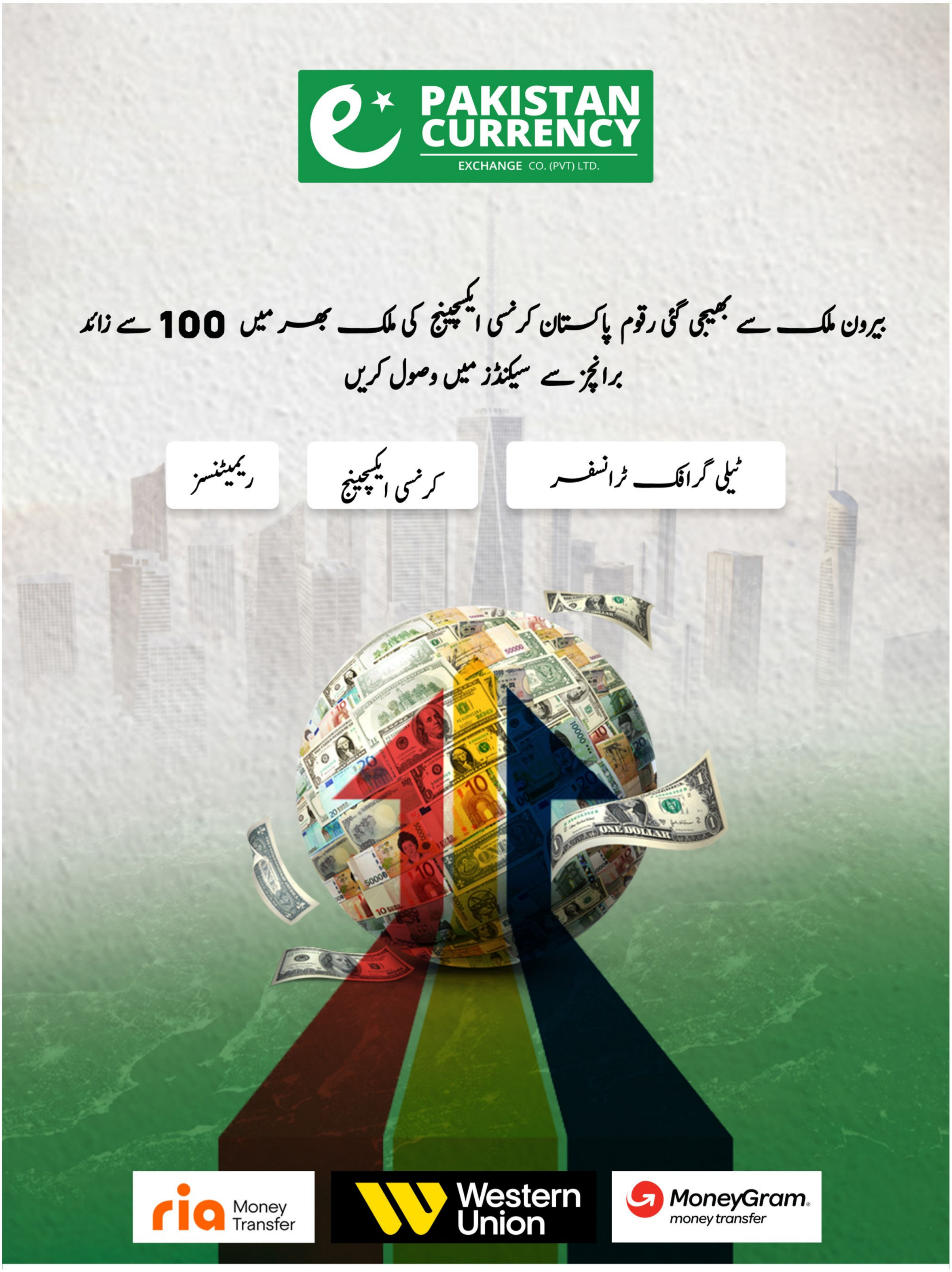

pkcurrency www.pakistancurrency.com 0304-6668810

قارئین

ماہنامہ اطراف کراچی

کو

عیدالفطر مبارک

رمضان المبارک کے
تینوں عشروں سے رحمتیں، برکتیں اور مغفرتیں
اپنے دامن میں لینے کے بعد عیدالفطر
کی خوشیاں، مسرتیں ہمارا حق بنتی ہیں
اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے

کلیم فاروقی

چیئرمین: ٹیکنالوجی لنکس

صدر، پاکستان جاپان بزنس فورم

اپنے گھر کا خواب آپ دیکھیں۔۔۔۔تعبیر ہم دیں گے
بن احسان گرین سٹی
خواب سے تعبیر تک۔۔۔۔تعبیر سے تعمیر تک
تعمیر سے تکمیل تک
بن احسان آپ کے ساتھ
APPROVED BY SDA & SBCA APPROVED BY
ملیر ایکسپریس وے کی تکمیل کے ساتھ بن احسان کا شہر سے راستہ صرف چند منٹ کی ڈرائیو پر
M9 موٹر وے کی شاندار لوکیشن پر
اپنا لیزڈ پلاٹ حاصل کریں
ترقیاتی کام تکمیل کے آخری مراحل میں
FOR BOOKING & DETAILS:
A PROJECT OF:
HMN HOLDINGS
YOUR DREAM, YOUR VISION, OUR PRIORITY
بن احسان
BIN AHSAN
Builders & Developers
CALL NOW: 0330-2135551